اقبال اور ہمارے فکری رویّے

ڈاکٹر سلیم اختر

اقبال اور ہمارے فکری رویّے

اقبال اور ہمارے فکری رویّے

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگ میل پبلی کیشنز۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

طبع اوّل : ——— ۱۹۸۲ء

تعداد : ——— ۱۱۰۰

طابع : ——— سندھ ساگر پرنٹرز لاہور

ناشر : ——— نیاز احمد

سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

کتابت : ——— زاہد

قیمت : ۳۴۰ روپے

انتساب

والد محترم قاضی عبدالحمید قریشی کے نام

ترتیب

پیش لفظ ۹

دیباچہ (جگن ناتھ آزاد) ۱۳

مفکرِ عالم

علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں ۲۹

اقبال کا لسانی شعور ۴۹

جزو، کل اور اقبال ۵۹

اقبال اور ہمارے فکری رویّے ۷۳

اقبال کے اساتذہ ۹۱

علامہ اقبال اور نیرنگِ خیال ۱۰۵

ممدوحِ عالم

عظمتِ اقبال کا معترف: ہربرٹ ریڈ ۱۲۹

اقبال ممدوحِ عالم ۱۳۵

یزان میں اقبال شناسی کی روایت ۱۶۳

ایک فرانسیسی اقبال شناس ۱۷۷

اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت ۱۸۵

پیش لفظ

"علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں" کتاب کا پہلا مقالہ ہے اور آخری ہے۔ "اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت" اول الذکر فراق گورکھپوری کے علامہ اقبال کے خلاف ایک مضمون کا جواب ہے جبکہ موخرالذکر مقالے بلکہ کتاب کے آخری چار مقالات میں بین الاقوامی سطح پر اقبال شناسی کی روایات کے آغاز اور فروغ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں دیکھیں تو پہلے مقالے کی صورت میں وہ صورت حال نظر آتی ہے۔ جب علامہ اقبال کے پیغام کی حسن کی قوت سے خوف کا اظہار کرتے ہوئے ان پر اعتراضات کیے گئے۔ ان اعتراضات کا سلسلہ اقبال کے اولین مبصر پروفیسر ڈکنسن سے شروع ہوا اور فراق گورکھپوری کی صورت میں سال اقبال (۱۹۷۷ء) تک جاری نظر آتا ہے۔ میں بحیثیت نقاد اس بات کے حق میں نہیں کہ ہر اس مضمون کا نوٹس لینا فرض ہو جاتا ہے جس کے خیالات ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں۔ اقبال جیسے مفکر کی صورت میں بحث کے دروازے کبھی بھی بند نہیں کیے جا سکتے اور نہ ہی اقبال پر تنقید سے ان کی عظمت یا اہمیت میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں ان لوگوں کے حق میں نہیں جو علامہ اقبال کو ماورائے نقد سمجھتے ہوئے ان پر تنقید کرنے والوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتے ہیں۔ لیکن جب معاملہ فراق گورکھپوری جیسے بھارتی

دانش ور کا ہو اور حقائق سے جان بوجھ کر چشم پوشی کی گئی ہو تو پھر جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پاکستان میں اس کا جواب دینے کی صرف مجھے توفیق نصیب ہوئی، حالانکہ اس ملک میں اخباری مضامین کی صورت میں فوری ردّعمل ظاہر کرنے والے ناقدین کی بھی کمی نہیں اور نہ ہی ایسے اقبال شناسوں کا قحط ہے جنہوں نے علامہ اقبال کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر رکھے ہیں۔

آخری چار مقالات میں بھی بالواسطہ طور پر فراق گورکھپوری کے بعض اعتراضات کا جواب آجاتا ہے ویسے ان مقالات سے فکر اقبال کی تحسین کا بین الاقوامی تناظر اجاگر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اتنے وقیع تھے کہ مواد کے لحاظ سے محض قومی ثابت ہونے کے برعکس بین الاقوامی اہمیت کے حامل ثابت ہو رہے ہیں، ورنہ دنیا بھر کے مفکرین علامہ کی مدح میں یک زبان نہ ہوتے، نہ ان کے کلام کے تراجم ہوتے اور نہ دانشوروں نے ان کے افکار، تصورات کی تفہیم اور فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کی ہوتیں۔ اقبالیات میں اس نوع کا مواد نہ ہونے کے برابر تھا کہ جس سے علامہ اقبال کی عظمت کی بین الاقوامی حدود اجاگر ہوتی ہوں، مجھے توقع ہے، کہ یہ مقالات اس کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے ساتھ ساتھ صاحب نظر اقبال شناسوں کو اس ضمن میں مزید جستجو کی طرف مائل بھی کریں گے۔ اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے اختتام پر ایک کتابیات بھی ہے جیسا کہ اس نوع کے کاموں میں ہوتا ہے۔ اس کتابیات کے ہر لحاظ سے جامع اور مکمل ہونے کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود بھی اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایات کے ضمن میں مزید تلاش و جستجو کرنے والے اصحاب اس کتابیات سے مایوس نہ ہوں گے کہ مزید کام کے لیے یہ کتابیات ایک سے زائد امور میں راستہ

دکھا سکتی ہے۔

اقبال کو ممدوحِ عالم قرار دینے کے بعد جب اپنے ہاں اقبال شناسی کا جائزہ لیں تو خاصی مایوسی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اقبال پرستی نے اقبال کا ایک CULT بنا دیا جس میں اصل اقبال گم ہو کر رہ گیا۔ اقبال بحیثیت انسان (بلکہ بحیثیت مرد) کیسا تھا، ان کی شاعرانہ فکر کے نفسیاتی سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں اور ان سب نے اقبال کی تخلیقی شخصیت پر کس نوع کی اثر اندازی کی — یہ ہیں اقبالیات کے اصل موضوعات لیکن ہوا اس کے برعکس چنانچہ خودی، بے خودی، تعلیم، مردِ مومن، شاہین، عقل و عشق جیسے متعین موضوعات پر فارمولا مضامین گھڑے جا رہے ہیں۔ اقبال اور ہمارے فکری رویے میں میں نے یہی نکتہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال سے اپنی تمام تر خوش عقیدگی کے باوجود ہم ابھی تک صحیح اقبال کی تفہیم میں ناکام رہے ہیں۔ یہ مقالہ "بین الاقوامی اقبال کانگریس" (لاہور: ۱۹۷۷ء) میں پیش کیا گیا تھا اور بے حد پسند کیا گیا۔ اپنی بعض تلخ باتوں کے باوجود!

دیگر مقالات میں سے بیشتر کسی تقریب یا جریدہ کے لیے فرمائشی طور پر قلم بند کیے گئے تھے: "علامہ اقبال اور نیرنگ خیال" نقوش کے اس شمارہ کے لیے محمد طفیل صاحب نے لکھوایا تھا جو "نیرنگ خیال" (اقبال نمبر ۱۹۳۲ء) کی اشاعتِ ثانی کے لیے وقف تھا اس مقالہ کے حوالہ سے بعض ایسی تحریریں اور شخصیات نمایاں ہوتی ہیں جو اب اقبالیات میں خصوصی مرتبہ حاصل کر چکی ہیں اور اقبالیات کے دورِ اول میں اساسی اہمیت کی حامل قرار دی جا سکتی ہیں۔

کتاب کا دیباچہ مشہور اقبال شناس جناب جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے۔ انہوں نے اسے روایتی دیباچہ نہ بناتے ہوئے اقبال کے ضمن میں کئی اہم امور پر گفتگو بھی کی اور بعض باتوں میں مجھ سے اختلاف بھی کیا یوں یہ دیباچہ بذاتِ خود ایک جامع مضمون کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے جس محبت سے یہ دیباچہ لکھا اس کے لیے میں سراپا سپاس ہوں!

سلیم اختر

لاہور:

پہلا دن ۱۹۸۲ء

دیباچہ

اقبال نے ۱۹۱۴ء میں جب کہا تھا "من ندائے شاعر فردا ستم" تو غالباً وہ کوئی قبولِ دعا کا لمحہ تھا۔ ۱۹۱۴ء کے بعد ہندوستان اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی شاعری میں طرح طرح کے رجحانات نمودار ہوئے لیکن اقبال کے شاعر فردا ہونے کا تصور ایک اٹل نظریے کی طرح رہا۔ اقبال کے متعلق سید عبداللطیف، ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر سجاد انند سنہا، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری اور باقر مہدی کی منفی انداز کی تحریروں کے باوجود اقبال کی از سرِ نو دریافت کا کام مسلسل جاری رہا اور اقبال صدی تقاریب کے سال میں (۱۹۷۳ء) سے شروع ہو کے آج تک چل رہا ہے، یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے کہ ایک تو اقبال پر بحیثیت شاعر کے بہت کام ہونا باقی ہے اور دوسرا اقبال کے فکر کی تہ در تہ معنویت کی تلاش میں اقبال پرستی کے چوکھٹے کے اندر نہیں بلکہ اس سے آزاد ہو کے ہمیں بہت کام کرنا ہے۔

دراصل اس ضمن میں صرف ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں کام شروع ہو چکا ہے لیکن یہ ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ یہ کام اس کام کا ایک ارتقائی تسلسل ہے جو اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہوا تھا، لیکن یہ تسلسل ہو کر بھی پرانے کام سے بہت مختلف ہے اور اس کے سامنے جس طرح سے نئے طور ابھر رہے ہیں اور نئی برق تجلی چمک رہی ہے اس کی موجودگی میں یہ مرحلہ شوق آسانی سے طے ہوتا نظر نہیں آتا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مجھے اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ہندوستان [illegible]

ذہن میں [illegible] ہے کہ اقبال پر اس وقت تک [illegible]

نیک [illegible] نہیں ہوں گی۔ حالانکہ کلام

اقبال [illegible] ہے کہ [illegible] ہر ایک [illegible]

[illegible] نہیں [illegible] ہے کہ [illegible] ہے۔

سید [illegible] کو اس بات کا احساس ہے کہ آج اقبال سے شاعروں کے ساتھ [illegible] بڑا کام اقبال کی [illegible] ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اقبال کی زندگی شخصیت اور شاعری کے ہر گوشے پر مکمل کتاب [illegible] جائے۔ اقبال کو چھوٹے پیمانے پر پیغمبروں کے برابر ٹھہرانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نقادوں کی تحریریں [illegible] سے آگے نہ جا سکیں گی۔ اپنے مقالے اقبال کا نفسیاتی مطالعہ میں سلیم اختر اس تنقیح طلب [illegible] پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اقبال کو ایک مفکر، [illegible] اور فلسفی کے روپ میں پیش کرنے والے یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ [illegible] ہوتا [illegible] ذہن [illegible] ترقی [illegible] ہو گئے چنانچہ اگر فلسفے سے کوئی چونکا دینے والی بات

سامنے آجائے تو ذہن کو گویا ۴۴۰ وولٹ کا جھٹکا سا لگتا ہے۔

اس ضمن میں شبلی کا ذکر کرتے ہوئے حالی کی یہ تحریر دہراتے ہیں:

"..... کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النبی، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھیں۔ غزلیں کیا ہے کہ ہیں شراب دو آتشہ ہیں جس کے نشے میں خمار چشم ساقی ملا ہوا ہے۔ (حالی بنام شبلی)

مشہور انگریزی مصنف نرد چودھری ٹیگور پر اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

"بنگالی ٹیگور کو بت بنا کر جتنا زیادہ اس کی پرستش میں مصروف ہیں اتنا ہی وہ صداقت سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ٹیگور کی حقیقی عظمت کو دیکھنے کے بھی ناقابل بنتے جا رہے ہیں۔ اس سے معبود اور عبد دونوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ گزشتہ کئی برس سے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اقبال سیمیناروں میں شرکت سے اور ان کے متعلق کثرت سے مقالات اور کتابوں پر نظر ڈالنے سے میرے دل میں کئی بار یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا نرد چودھری نے جو بات ٹیگور کے متعلق کہی ہے اس کا صدق کہیں اقبال کے تعلق سے ہم لوگوں پر بھی تو نہیں ہو رہا ہے۔

اقبال کو خود اس بات کا شدید احساس تھا کہ ایک ایسا وقت آسکتا ہے جب میری شخصیت اور شاعری دونوں ایک معبود کی صورت اختیار کر لیں۔ چنانچہ اپنی شاعری کے متعلق انھوں نے کئی موقعوں پر قاری کو یہ کہہ کر اس خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے:

کرم شب تاب است شاعر در شبستان وجود
در پرد بالش فروغ گاہ ہست و گاہ نیست

لہ: "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" بمبئی ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
نہ بینی خبر ازاں مرد فرد دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست[1]

اقبال کے متعدد شاعرانہ اسالیب کے یہ دو ایک پرتو ہیں جو ہمیں ان اشعار میں نظر آ رہے ہیں ویسے اقبال نے یہ بات کئی اسالیب کے ذریعے سے اپنے قاری تک

---

[1] فراق گورکھپوری کی طرح کے نقادان شعار سے جو مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ذہنی دیانت پر مبنی نہیں۔ انہیں مندرجہ ذیل اشعار کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو اقبال نے اپنے متعلق غنی کاشمیری کی زبان سے کہلوائے ہیں۔

خاک ما بے شرر دانی اگر — بر درون خود یکے بکشا نظر
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجا است — ایں دم باد بہاری از کجا ست
ایں ہمہ باد است کز تارِ رد
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو

اے کہ خواندی خط سیمائے حیات — اے بر خاور دادہ غوغائے حیات
اے ترا آہے کہ می سوزد جگر — تو ازو بے تاب و ما بے تاب تر
اے ز تو مرغ چمن را پائے دہو — سبزہ از رشکِ تو می گیرد وضو
اے کہ از طبع تو کشت گل رسید — اے ز امید تو جانہا پر امید
از نوا تشکیل تقدیر امم — از نوا تخریب و تعمیر امم
نشتر تو گرچہ در دلہا کشید — مر ترا چونانکہ ہستی کس ندید

پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم — آں متاعم کہ شد دوست ز دیدہ بصراں
چہ رفت خویش بدستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست

دیں گلشن پریشاں مثل بوئم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئم
بادہ رازم و پیمانہ گسارے جوئم — در خرابات مغاں گردش جائے جوئم
نہ من آغاز و نے انجام جوئم — ہمہ رازم جہاں راز جوئم
تو جوان خام سوزے سخنم تمام سوزے — غزلے کہ سرائم بہ تو ساز گار باد
زیاں بینی ز سیر بوستانم — اگر جانت شہید جستجو نیست
نمانم آں چہ ہست اندر رگ گل — بہار من طلسم رنگ و بو نیست

اقبال کے فلسفہ و شعر کی ساری داستان ایک داستان تلاش حق ہے۔ فلسفہ اقبال کے لیے زندگی کا ایک نظریہ نہیں بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک سلیقہ ہے۔ فلسفہ اقبال کے لیے کوئی الگ تھلگ موضوع نہیں ہے بلکہ ہر موضوع کے مطالعے کا ایک انداز ہے۔ اگر فلسفے کو ایک

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ سے آگے

بہ دہ تو از نوائے شاعری است — آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

تازہ آشنید بے فکر اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت

الگ موضوع تصور کر لیا جائے تو اقبال اس کے شدید ترین مخالف نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایک موقع پر یہ کہا تھا :

"میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے میرے پاس کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں مختلف نظام ہائے فلسفہ سے نفرت کرتا ہوں۔ مجھے نہ فلسفے کے اصولوں پر بھروسہ ہے نہ اس کے نتائج پر۔ شاید ہی کسی شخص نے فلسفے کی اس شدت سے تردید کی ہو جیسے میں نے کی ہے۔

اس فلسفے کی جس سے مذہب کے اساسی اور قطعی حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے ایسے موضوعات پر لکھی ہے جس سے فلسفیوں کو بھی دلچسپی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ موضوعات محض فلسفیانہ استدلال و براہین نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔"[۱۰]

فلسفے کی جانب اقبال کا یہ رویہ اس اعتبار سے بڑا معنی خیز ہے کہ ان کے دل ناصبور کی ساری تڑپ ان کے سوالات میں سمٹ کر آگئی ہے۔ اقبال کا دل سراپا استفسار، سراپا سوال اور سراپا جستجو ہے اور ہر وقت "کیونکر" اور "کیوں" کی عقدہ کشائی میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں اقبال براؤننگ کے ہمنوا ہیں جو یہ کہتا ہے کہ "زندگی مفہوم سے لبریز ہے میرا مقصد اس مفہوم تک پہنچنا ہے" اور استفسار کی یہ کیفیت اقبال کے یہاں اول سے آخر تک نظر آتی ہے۔

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں — زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں

یہ تلاش مستقل شمع جہاں افروز ہے — تو من ادراک انساں کو خرام آموز ہے

کبھی وقف دید تھی لب مائل گفتار تھا — دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا

---

۱۰ "EMINENT MUSLMANS". MADRAS - 1926.

اے مئے غفلت کے سرشار و کہاں رہتے ہو تم
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی
اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل

کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے

واں بھی کیا فریاد بلبل پہ چمن روتا نہیں
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا

آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گردوں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق
آواز کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ
اک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے
لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھر اس محمل میں ہے

کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطف صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

دردِ استفہام سے واقف ترا پیدا نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

کس کی نمود کے لیے شام و سحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار میں بارِ گراں ہے تو کہ میں

اور یہ کوئی محض اتفاق کی بات نہیں کہ اقبال کے آخری مجموعۂ کلام کی آخری نظم کا آخری شعر ایک سوال کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

اگر مقصود گل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

اقبال نے جن فلسفیانہ مسائل کے حل کو خالص شاعری کے انداز میں پیش کیا ہے ان کی فلسفیانہ اور شاعرانہ دونوں طرح کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اقبال کے ناقدوں نے اقبال کے دل ناصبور کی اس کیفیت کو جو اقبال کے یہاں استفہام کی صورت میں نمودار ہوتی ہے جس طرح سے نظر انداز کیا ہے وہ بھی برصغیر کے اردو اور فارسی ادب کا ایک بہت بڑا منفی نوعیت کا باب ہے۔

اقبال کی شاعری کا ان سوالات کے ساتھ دوسرا اہم پہلو جس کا ہم ذکر ہے جس کی طرف اقبال نے خود "STRAY REFLECTION" میں اشارہ کیا ہے:

"میتھو آرنلڈ بہت صحت اور صراحت پسند شاعر ہے میں شاعری میں ایک حد تک اخفاء اور ابہام کا عنصر پسند کرتا ہوں کیونکہ مبہم اور مخفی پیرایہ بذباتی اعتبار سے عمیق و غائر معلوم ہوتا ہے۔" [1]

یہ اخفاء و ابہام کا عنصر اقبال کی شاعری کی جان ہے۔ لیکن اخفاء و ابہام کے اس عنصر کو اقبال نے ایک اسلوب عطا کیا ہے کہ بظاہر اقبال کا انداز بیان کئی موقعوں پر براہ راست اور دوٹوک معلوم ہوتا ہے، حالانکہ اگر ذرا غور کیا جائے تو وہی انداز بیان جو بادی النظر میں براہ راست نظر آتا ہے۔ دراصل تہ در تہ معنویت کا حامل ہے۔

---

[1] "شذرات فکر اقبال" لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۴۰

چونکہ اقبال کے نقادوں نے اقبال کی شاعری پر نہیں لکھا یا فکر اقبال کے مقابلے میں بہت ہی کم لکھا ہے اس لیے نئی نسل کے بعض ان شاعروں اور ادیبوں کے دلوں میں جن کا ادبی روایت کے ساتھ رشتہ کمزور تھا۔ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اقبال کی شاعری محض POETRY OF STATEMENT ہے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کو کچھ ایسے اشعار بھی محض ایک صحافتی قسم کا بیان نظر آنے لگے جن میں روح شعر پردہ بہ پردہ اور نہ بہ تہ تڑپتی نظر آ رہی تھی جیسے:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات
اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس — اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا — یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

حالانکہ یہ سامنے کی بات ہے کہ اقبال نے اردو شاعری کو جو آہنگ دیا اس سے پہلے ہم اردو والے اس آہنگ سے آشنا نہ تھے۔ یہ آہنگ اقبال کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس لیے نئی نسل کے لیے اس آہنگ کو پہچاننا آسان نہیں تھا۔ ان حالات میں اقبال کے کلام کی موسیقیانہ کیفیت پر اور زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن اقبال کے نقادوں نے بڑی حد تک اسے بھی نظر انداز کیا۔ سلیم اختر کی نگاہ ان تمام مسائل تک پہنچی ہے ان کی تالیف "اقبال کا ادبی نصب العین اہل نظر کو دوبارہ اقبال کے حسن کلام کی طرف متوجہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ "فکر اقبال کے منور گوشے" میں انھوں نے کمال محنت سے ان مضامین کو جمع کیا ہے جن میں ایک طرف اقبال کی شاعری پر بھرپور روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف

اقبال کی شاعری کے وہ پہلو اجاگر ہوتے ہیں جنہیں آج ارادۃً یا سہل انگاری کی بنا پر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کے قریباً تمام مقالات اقبال کے فکر و فن کے نئے پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔

ان دو تالیفات کے بعد سلیم اختر "اقبال اور ہمارے فکری رویے" گیب دہ کے نام سے اقبال کے متعلق اپنے مقالات کا مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ مجموعہ جو بارہ مقالات پر مشتمل ہے اقبالیات میں ہر اعتبار سے ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

"اقبال ممدوحِ عالم" میں سلیم اختر نے اقبال کے فکر و فن کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے ایک بہت عمدہ بات کہی ہے: "اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے پیش نظر کلام اقبال میں آفاقیت کا مسئلہ اپنے حل کے لیے کسی نظریاتی بحث سے بہت کر اب عملی صداقت کا روپ دھار چکا ہے۔ یہ تو آفتاب آمد دلیل آفتاب ایسی بات ہے۔ اس ضمن میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہیے کہ مختلف ممالک میں اقبال شناسی کے آغاز اور پھر ایک باضابطہ فکری روایت بننے کا باعث ہماری یا دوسری حکومتوں کی سرپرستی نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ کبھی کبھار غلطی سے ہمارے سفارت خانوں نے بھی یہ فرض کا اہتمام کیا ہوگا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نکلسن، آربری، ہیریٹ ربڈ، ای ایم فارسٹر، این میری شمل، بوزانی، لوس کلاڈیئس، گوڈن پولنکایا، پرمی گارنیا، نتاشا ... سے پیرین نینس ایسی شخصیات محض ہمارے سفیروں کے شوق و سوخ کی وجہ سے اقبال کو اپنا موضوع نہ بنا سکتی تھیں۔" سلیم اختر کی اس پرمغز تحریر میں میں یہ اضافہ کروں گا کہ اگر یوم اقبال کو سفیروں اور سفارت خانوں کے تعلق سے آزاد کر دیا جائے تو اقبال کا فکر و فن اور زیادہ ادب، فلسفہ، تاریخ اور سیاست کے مابین علموں کا مرکز فکر بن جائے گا۔

کوئی ایک ڈیڑھ ماہ قبل روس میں اس کام کی ایک جھلک جو روس میں ہو رہا ہے دیکھ کے آیا ہوں۔ پریگارینا کی اقبال پر دو کتابوں کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر نے کیا ہے کلام اقبال کے ساتھ پریگارینا کی دلچسپی کا جو عالم ہے وہ میں شاید لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ ماسکو میں پروفیسر مادام چیودا کے گھر جب پریگارینا سے تنہا راقم التحریر سے ملنے آئیں تو کلیات اقبال ان کے ہاتھ میں تھی اور اس محفل میں کوئی آٹھ نو گھنٹے تک مسلسل اقبال اور فکر و فن اقبال کا ذکر جاری رہا۔ پریگارینا کے دو شاگرد، ایک طالب علم اور ایک طالبہ علم جن کے نام میں بھول رہا ہوں اس وقت اقبال پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ طالب علم گلشن راز جدید پر اور طالبہ علم ضرب کلیم پر۔ یہی کیفیت میں نے لینن گراڈ میں دیکھی اور تاشکنت میں تو بزم اقبال ایک بڑی فعال ادبی جماعت ہے جس کے جلاس ہر پندرھویں روز منعقد ہوتے ہیں۔ ایران کے ڈاکٹر احمد علی رجائی کی یہ بات غلط نہیں ہے کہ اقبال ایک نو دریافت براعظم کی مانند ہیں جس میں کتنی ہی دلآویز اور قابل غور چیزیں ہنوز بحث طلب ہیں۔ لیکن ان دلآویز اور قابل غور چیزوں کی طرف ہم اہل ہند اور اہل پاکستان نظر اٹھا کے دیکھیں بھی تو۔

اقبال کے اساتذہ ایک گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں سلیم اختر نے جو نکتہ پیدا کیا ہے وہ خاصا اہم ہے۔ ان کی اس بات کی تردید مشکل ہے کہ اقبال کے اساتذہ کا ذکر کرتے وقت ہمیں داغ اور آرزو سے کم حیثیت حالی، اکبر اور رومی کو نہیں دینی چاہیئے۔ بلکہ اس ضمن میں مرشد رومی کا مرتبہ تو سب سے بلند ہے لیکن مولوی میر حسن کو داغ اور آرزو کی صف میں رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بات ایک مفروضہ ہے کہ اگر اقبال مولوی میر حسن سے فارسی نہ پڑھتے تو کسی اور سے بھی پڑھ کر فارسی کے اتنے بڑے شاعر ہو سکتے تھے۔ اس طرح کے HYPOTHESIS کو بنیاد بنا کر کسی نتیجے پر پہنچنا دشوار ہے، کیونکہ اس طرح سے نکالا ہوا نتیجہ

دونوں طرح کی متضاد آرا پر مبنی ہو سکتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اقبال پیرس جا کر مسجد قرطبہ نہ دیکھتے تو وقت اور عشق کے متعلق وہ ایسے شعر کہہ سکتے تھے جو اس نظم میں موجود ہیں اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ مولوی میر حسن کو داغ اور زخم کی سطح پر رکھنا اس لیے بھی موزوں نہیں کہ اقبال مولوی میر حسن کے ہاتھ میں اس وقت آئے جب وہ بچے تھے اور بچے کی ذہنی تربیت میں استاد کا جو حصہ ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ذہنی کس دست ہنر میں پہنچی ہے اس کا مستقبل کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

علامہ اقبال اور نیز ایک نہایت ایک بھرپور مقاربت جو نقوش اقبال کے نیز میں اقبال منبر میں شامل ہو۔ یہ اس خاص منبر کا آخری مقاربت اور میرے نزدیک اس منبر پر اس کی حیثیت یقیناً ترقی کی ہے

اقبال اور جدید فکری رویے زیر نظر مجموعہ مقالات کا اہم ترین مضمون ہے جس میں ڈاکٹر سلیم اختر نے فکر اقبال کے تناظر میں اقبال کے متعلق دو فکری رویوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں برصغیر کے فکری رویوں میں سرسید کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں کہ اقبال نے سرسید احمد، اکبر سے خصوصی طور پر متاثر ہونے کے باوجود فکری رویوں اور فکری زاویوں سے وابستہ اشیاء اور افکار و تصورات کو جتنی اہمیت دی ہے اس سے ابھر کر انہوں نے ان سب کو ہدف تنقید بنایا۔ میرے نزدیک یہ تصور کا ایک پہلو ہے۔ اقبال نے مغرب کی جانب دو رویے اختیار کیے۔ جہاں تک مغرب کی مادیت پرستی اور فکری یک رخے کا تعلق ہے اسے اقبال نے ہدف تنقید بنایا لیکن مغربی علوم و فنون کو اقبال نے ہمیشہ سراہا ہے۔ خطبات اسلامیہ میں آپ لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خطبات اسلامیہ زندگی کی ایک لطیف عمارت ہے۔ وہ دن گئے جب یورپ کے فلاسفہ نے

سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب منظر یہ ہے کہ ذہنی اعتبار سے عالم اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب و تاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہو جائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر خمیر اور باطن تک پہنچنے میں قاصر رہیں۔ اس موقع پر اس خطا کا تو رد بھی نامناسب نہ ہوگا جو علامہ اقبال نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو اس وقت لکھا جب آپ THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کو مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس خط میں اقبال لکھتے ہیں:۔ "میری زندگی کا بیشتر حصہ یورپین فلسفہ کے مطالعہ میں گزرا ہے اور یہ نقطۂ نگاہ میری فطرت ثانیہ بن گیا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کے حقائق اور اس کی صداقتوں کا مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں۔" یہی خیالات ہمیں اقبال کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قرص دوست
حکمت او را نہ از ما دیں است — نے فروغش از خط و تلیں است
قوت افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست — مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ — مغربی باید نہ ملبوس فرنگ

ف: ترجمہ از سید نذیر نیازی

اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست　　ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست

ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ سوال بہت اہم ہے کہ آج اقبال کی تخلیقی زندگی کی پون صدی کے بعد ان کے انتقال کے چالیس برس بعد اور پاکستان کی تیس سالہ زندگی کے بعد ہمارے فکری رویے علامہ کے فکری رویوں سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا تعلق صرف پاکستان کے ساتھ نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر اس ملک کے ساتھ ہے جہاں اقبال پر کام ہو رہا ہے خواہ وہ ہندوستان ہے، روس ہے، امریکہ ہے، فرانس ہے یا جرمنی ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، دل کی بات جو فاضل مصنف نے کہی ہے وہ نہیں صرف پاکستان ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر اس ملک کے لیے غور طلب ہے جہاں پوری سنجیدگی کے ساتھ اقبال کی دریافت نو پر کام شروع ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا اقبال کے ایک شعر کے حوالے سے یہ کہنا کہ افکار کی نظر بندی کے لیے پاکستان سے بڑھ کر بہتر غار اور کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اول تو پاکستان میں اقبال پر جو کام ہو رہا ہے اس سے اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے نئے آفاق اور عالمی پہلو ابھر آئے اور اقبال عالمی کانفرنس نے بحیثیت نوع جس رجحان کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے بعد تو یہ امکانات اور زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال ایسے عظیم المرتبت شاعر کو صرف پاکستان سے وابستہ کرنا بھی زیادتی ہوگی جتنی یہ سمجھنا کہ صرف پاکستان کا شاعر کہنا یا کہنے کو فخر جرمنی کا ہے۔ اقبال کے افکار کے از سر نو تجزیے اور ان نہفتہ امکانات کی کوششیں ہیں ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں اقبال پر کام کرنے والوں کی منزل ایک ہی ہے۔ درویش خدمت نہ شرقی ہے نہ غربی!

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ کتاب اقبال اور ہمارے فکری رویئے اقبالیات کے موضوع پر ایک فکر انگیز کتاب ہے جو قدم قدم پر قاری کو سوچ بچار کی دعوت دیتی ہے۔ پاکستان میں تو یہ کتاب چھپ ہی رہی ہے اگر یہ طباعت کے بعد ہندوستان آ سکے تو اس کے مباحث اقبالیات کے تعلق سے یہاں بھی فکر و نظر کے قافلوں کو آگے بڑھانے میں مدد ثابت ہو سکتے ہیں۔

شعبہ اردو:
جموں یونیورسٹی جموں

جگن ناتھ آزاد

۱۴ر نومبر ۱۹۷۸ء

علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں

فراق گورکھپوری کے مضمون کے بارے میں چند معروضات

"افکار" (نومبر ۱۹۷۸ء) میں مندرجہ بالا عنوان پر جناب فراق گورکھپوری کا مضمون طبع کرتے وقت اجمد بیرکا ان سطور سے آغاز کیا گیا ہے:

"دنیا کے عظیم شاعروں اور دانشوروں کی شخصیت و فن ہمیشہ تنازعہ رہی ہے مثال کے طور پر غالب اور شکسپیئر کے نام بالکل سامنے کے ہیں۔۔۔"

بالکل درست بات ہے اور کسی شخصیت کا بھی نزاعی بن کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوتی کہ اس کی بطور خاص نوٹس لیا جائے لیکن نزاعی کے ضمن میں دو امور کا ملحوظ رکھنا لازم ہے اوّل اس شخصیت کی اہمیت اور دوم نزاع برپا کرنے والے کی نیت۔ غالب شکسپیئر یا اور کسی ادبی شخصیت کو لے لیجئے یہ سب محض ادیب تھے، بہت بڑے ادیب عظیم ادیب۔ لیکن اوّل تا آخر ادیب، اس لئے ان پر جو بھی اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں وہ ان کے فن اور شخصیت سے وابستہ ہونے کی بناء پر سر آنکھوں پر۔ ملکہ ضرورت پڑنے پر ہر شخص بقدر ہمت اوست ایسا کرنے کی اہلیت ثابت کر سکتا ہے۔ ویسے بھی اعتراض کرنے میں ہرج کسی کا کیا جاتا ہے؟

لیکن اقبال اور غالب یا شکسپیئر یا اور کسی شاعر ادیب کا نام اکٹھا نہیں لیا جا سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال تصور پاکستان کے خالق ہیں وہ روایتی معنوں

میں شاعر نہ تھے بلکہ وہ کچھ آئیڈیل لے کر آئے تھے ایسے آئیڈیل جو پاکستان کی صورت میں معجزہ فکر ثابت ہوئے۔ اسی لئے علامہ نے خود کو بھی معاصر شعراء کی صف میں دیکھنا پسند نہ کیا۔ علامہ اقبال نے محض اپنے مقاصد خاص کے ابلاغ کے لئے شاعری کو مقبول عام ذریعہ بنایا جس کا اظہار انہوں نے کئی مکاتیب میں کیا ہے۔ چنانچہ علامہ لکھتے ہیں:

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور کبھی اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں"۔ [1]

ایک اور مکتوب میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔۔۔۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست" [2]

شعر و سخن تہمت تھی اس لئے وہ یہ کہہ سکے:

"میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعراء میں میرا شمار ہو"۔ [3]

خطوط اور اشعار سے اس نوع کی مزید مثالیں بآسانی تلاش کی جا سکتی ہیں اس لئے مضمون کی ابتداء میں لکھا گیا تھا کہ اقبال غالب شیکسپیئر یا کسی عظیم شاعر

---

[1] "اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص: ۸-۱
[2] ایضاً ص: ۱۹۵ [3] ایضاً ص: ۲۵۴

کی، مندرجہ تھے دل سے لیکر فراق تک اردو میں عظیم شعراء کی کمی نہیں رہی، ہاں کمی ہے تو فلسفی کی، مفکر کی، حکیم کی۔ اور یہ سب کچھ علامہ اقبال تھے ان کی شاعری ان کے فکر کی گواہی دیتی ہے وہ فکر جلیل جس کے اثرات سے اردو شاعری اب تک رفعتوں سے روشناس ہوئی لیکن اس پر بھی یہ سچ ہے کہ وہ عام معنوں میں فراق جیسے شاعر نہ تھے یہ تو قوم کے مذاق بلکہ ابدی مذاق زیادہ بہتر نقطہ ہے اگر مدنظر رکھتے ہوئے فلسفہ کی خشکی دور کرنے کے لئے شاعری کا سہارا لیا اور پیغام کی گرل بار کی کو لطافت میں تبدیل کرنے کے لیے تشبیہات اور استعارات پہ انحصار کیا۔ اس لیے جب یہ کہہ کر فراق صاحب عمومی انداز میں شاعری کی مذمت کرتے ہیں تو اقبال کی شاعری ان اعتراضات کی زد میں نہیں آتی بلکہ تعجب اور افسوس اس بات کا ہے کہ فراق صاحب کے پایہ کا شاعر ابھی تک شاعری سے اس نوع کی مقصدیت کی آس لگائے بیٹھا ہے جس کا آج سے چالیس برس پہلے فیشن تھا اب تو روس میں بھی شاعری کو ایسی کڑی مقصدیت کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جاتا!

فراق صاحب فرماتے ہیں:

"دنیا کا اور اس زمانے میں کسی بھی ملک کا خواہ وہاں کے باشندے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں۔ سیاسی انتظام، اقتصادی انتظام، صنعت و حرفت تجارت کی ترقی اور ان کا تعلیمی نظام، بین الاقوامی مسائل کے حل اور اسطرح کے کئی سوالات جو ہماری زندگی اور موت کے مسائل اور سوالات ہیں۔ ان اہم ترین معاملات میں آج ہماری رہنمائی دنیا بھر کی شاعری نہیں کر سکتی نہ مجمل نہ مفصل ہدایتیں دے سکتی ہے اور نہ ان امور میں لیڈری اور نمایاں کارکردگی اور خوش انتظامی ہم شاعروں کو سونپ سکتے ہیں اور نہ ان کی

شاعری کو اگر جہان بھی میں کہ ان امور پر شعراء نے کچھ روشنی ڈالی بھی ہے
تو وہ روشنی کی بہت ہلکی سی کرن ہے جو پل بھر کے لئے چاند چاند
پیدا کر کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

اس اقتباس میں یہ اگر ان سطروں کا اضافہ کر دیا جائے جو ہندوستانی جمہوریت میں
شعراء کو اپنے دل کے بس انہیں جلا دیتی ہے۔ تو فراق غزل کی طرز سے ان کی
تخیل ہو جانے کی یوں شعراء اور شاعری دونوں کی ہو گئی ہے جہاں تک ۲۲ ہم
سر پیٹتے ہیں استدلال جو نہ منطقی ہے اور نہ فلسفیانہ ہے فراق جیسے شاعر کے
ذہنی تجسس ہوتا ہے کہ نصف صدی کی شاعرانہ زندگی گزارنے کے بعد اب ان پر شاعری
کے بے مصرف اور بے سود ہونے کا انکشاف ہوا ہے؟ اور کیا وہ روپ کو محض
مشغولیت اور اس کا خالق ہونے کی حیثیت سے خود کو کروڑ ذہنی قرار دیتے ہیں
کے میں کی انتظام، اقتصادی انتظام، صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی میں کسی طرح
سے بھی ممد و معاون نہیں ثابت ہو سکتی جب شاعروں کو لیڈر کی اور نوتی انتظامی نہیں
سونپی جا سکتی تو فراق صاحب بحیثیت ایک شاعر بھارت کے معاشرہ میں اپنے لئے کیا
مقام متعین کرنے کے درپے ہیں؟ غزل شاعری جس غزل اور رباعی کا وہ موجودہ معاشرہ
میں اپنا کیا کردار دیکھنا پسند کریں گے؟ تعجب ہے کہ فراق صاحب کے مرتبہ کا شاعر اس
حقیقت سے بے خبر نظر آتا ہے کہ شاعر کا کردار اس کے شاعر ہونے میں مضمر ہے اور
بس۔ لیکن جب موضوع اقبال جیسے شاعر کا ہو جو پہلے مفکر ہے اور شاعر بعد میں۔
تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فراق صاحب کے الفاظ میں امور زندگی میں شاعر
کے رہنمائی نہ کر سکنے کے باوجود علامہ نے اس سے یہ کام لیا اور اسے عالمگیر بنا دیا

فراق صاحب کو علامہ سے یہ بھی شکایت ہے کہ انہوں نے:

"مغربی سیاسی نظام اور مغربی تہذیب و تمدن سب کے متعلق حکم تو لگا دیا کہ تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں آپ ہی خودکشی کرے گی لیکن اس خطرناک حالت سے بچنے کے لئے ان کے پاس کیا کیا ہے تجویز کیا معجزہ کیا ہے تریاق ہیں اس طرف اقبال نہ کوئی مجمل اشارہ کر سکتے ہیں اور نہ مفصل"۔

فراق صاحب کے مرتبہ کے دانشور سے ایسی سطحی بات کی توقع نہ تھی علامہ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عروج مغرب میں زوال مغرب کی پیش گوئی کی اور جو انگلستان کی حد تک تو صحیح بھی ثابت ہو گئی ہے علامہ کا مقصد مغرب کو ممکنہ تباہی سے بچانا نہ تھا کہ تاریخ کے دھارے اور وقت کے تقاضوں سے کسی قوم کو کوئی بھی نہیں بچا سکتا یہ خودکشی ان کی مخصوص معیشت اور طرز زیست کا منطقی نتیجہ تھی۔ کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت زوال مغرب کی نوید سنائی جب غلام ہند کی آنکھیں مغرب سے خیرہ ہو چکی تھیں اور اہل ہند کے لئے وہ آقا سے بڑھ کر دیوتا کا روپ دھار چکے تھے ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم اول کے بعد جرمن تاریخ دان اسوالڈ سپینگلر کی شہرہ آفاق تصنیف THE DECLINE OF THE WEST شائع ہوئی تو اسے زبردست مقبولیت حاصل ہوئی یورپین ہونے کی بنا پر سپینگلر مغربی تہذیب کے تضادات کو بآسانی محسوس کر سکتا تھا اس لئے اس نے مغربی معاشرہ کی اساس میں منفی کو تلاش کر کے زوال مغرب کی بات کی مگر غلام ہند میں بیٹھ کر اقبال کا مغربی تہذیب کی خودکشی کی بات کرنا ان کی گہری تاریخی بصیرت کی دلیل بن جاتا ہے درحقیقت ایسے امور ہی کی بنا پر اقبال محض عظیم شاعر کی حیثیت سے بلند ہو کر مفکرین کی صف میں

[illegible] تخیل کی [illegible] زندگی کی بات نہیں بلکہ یہ فرد، قوم اور [illegible]
[illegible] تجزیاتی [illegible] دستاویزی حیثیت کی بنا پر [illegible] مغرب [illegible]
[illegible] کیا [illegible] کون سے [illegible] تجویز کر دیتے تھے

[illegible] کو ایک جاری [illegible] کے [illegible]
[illegible] بلکہ اقبال کے مغرب کے [illegible]
مغرب کی سب سے زیادہ مردہ [illegible] کی [illegible]
[illegible]

مغرب کے لئے جو [illegible] کے [illegible] کی [illegible] ہیں۔
[illegible] کہ [illegible] کے علاوہ میں [illegible] کی [illegible]
جو پیغمبر [illegible] اخوت [illegible] پادری [illegible] باتیں [illegible]
[illegible] خیال کرتے ہیں کہ مشرقی [illegible] کو ضرور کسی [illegible]
جذباتی [illegible] چاہیے کو [illegible] اور ذہنی طور پر [illegible]
[illegible] مرتبہ [illegible] کی [illegible] سے [illegible]
[illegible] مالک [illegible] تیز [illegible] اس [illegible] سے [illegible] چاہیے [illegible]
اس کی جھلک [illegible] پیش کی [illegible] کی [illegible]
ایک مغربی [illegible] کی [illegible] سے [illegible] آپ سے [illegible]
اقبال [illegible] راست [illegible] طلب [illegible] تو [illegible] جواب [illegible]
اسے [illegible] ہے کہ [illegible] اس وقت [illegible] جب

وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ [1]

کیا فراق صاحب کو اقبال آڑے ہاتھوں نہیں لیتا جو وہ اسے نہیں سمجھ پاتے؟

یا پھر یہ وجہ ہو کہ اقبال واقعی انہیں آڑے ہاتھوں لیتا ہو۔

فراق گورکھپوری اس بات سے سخت برافروختہ ہیں کہ اقبال کو ترجمان حقیقت کیوں کہا جاتا ہے اور انہیں مفکر کیوں تسلیم کیا جاتا ہے چنانچہ بقول فراق:

"... یوں کسی بے معنی رسالے یا فہم مفہوم میں جدت کو اقبال کو ترجمان حقیقت کہتے ہیں، ہم بنیادی مسائل کے علاوہ جب خالص فلسفے کے مشاہیر عالم کا ہم تصور کرنا چاہیں تو وہاں بھی اقبال کا نام نہیں آتا۔ اخلاقی، روحانی حیثیت سے ثروت مند ہونے والی شخصیتوں کی فہرست میں بھی ڈھونڈنے سے ڈاکٹر اقبال کا نام نہیں ملتا۔

اور اس سے قبل وہ یہ بھی لکھ چکے ہیں: "گو ڈاکٹر اقبال مشاہیر علم سیاست میں یک بیک ہوتے یا مشاہیر علم تصوف و ادبیات میں سے یک ہوتے یا ایسے ہی بعد اور عالمگیر موضوعات و مسائل کے عالم یا ماہر ہوتے تو ان تمام اہم اور عالمگیر علوم کی تاریخ میں یا انسائیکلوپیڈیاؤں میں ان کا نام ہوتا مگر کوئی سامان عالم بھی ان علوم اور مسائل پر کوئی مفید کتاب لکھتا تو ڈاکٹر اقبال کا نام اس کتاب میں ہرگز نہیں آتا۔

---

[1] THE MOSQUE OF CORDOVA: A SUPERFRAUD

(مقالہ مشمولہ، اقبال ریویو کراچی اپریل ۱۹۶۷ء)

میں اس مضمون کو کتابت میں تبدیل نہیں کر سکتا تھا دنیا بھر کے ممالک
میں اقبال پر جو کام ہوا ہے اس کی تفصیل پیش کر سکتا درآں حالیکہ دنیا بھر کے ممالک تو
بہت تو اس سے مراد محض ایسے ممالک نہیں ہوتے ہیں جو عصر حاضر کے تمام ممالک ہیں
اور تو اور روس چیکوسلوواکیہ اور دیگر سوشلسٹ ممالک میں اقبال پر کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے
اور معیار دونوں لحاظ سے بے حد وقیع ہے فراق صاحب کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیں
یہ حقیقت ہے کہ روس میں اقبال پر کام کرنے والے تو باقاعدہ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں
جبکہ فرانس، جرمن، اٹلی وغیرہ میں یہ اعزاز ڈاکٹریٹ مقرر ہے اور ایسے مقالہ نگار کی
کی صورت میں تو ایسے اہل علم ملتے ہیں جنہوں نے خود کو اقبال کے لئے وقف کر رکھا ہے
یہ نہیں بلکہ آج دنیا کی بیشتر مہذب زبانوں میں کام ہو رہا ہے اور ترجمے ہو رہے ہیں
مشرق و مغرب کے بیشتر ممالک میں اقبال کی غیر مشروط شاعری کی جا رہی ہے
اور مجموعی حیثیت کو سرقہ لینا کے مسیحا دیے رہے ہیں کے حوالے سے یہ بیان کیا جا سکتا ہے۔

یہ وہ پیغام ہے جس کی نسبت دوستی نے اس کی تاریخ کو شکل کر دیا ہے
اور یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہو خواہ وہ مسلم پاکستان
ہو یا ہندوستان ایران ہو یا روس کی کوئی سوشلسٹ جمہوریہ چین ہو یا یورپ
کی یونیورسٹیوں کے کسی طلباء کا اجتماع یا بعد حساب علموں کی کوئی ادبی
ہی محفل۔ ہر جگہ وہ نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے جنہیں سلامی

---

۲ اس کی نگرانی میں دو دو ریسرچ اسکالر علامہ اقبال پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں جبکہ
اقبال شناسی کے لئے بزم اقبال نے فرمائے جس کے باقاعدہ اجلاس ہوتے ہیں۔

۳ یہ اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے منصوبے میں ایک کتاب کی مرتب کی ہے جو پہلے محمد طفیل
کی ادبی میگزین لاہور میں طبع ہوئی اور اب اس کتاب میں شامل ہے

احیاء کے داعی محمد اقبال کے قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے[1]

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کسی خاص موضوع کے متعلق انسائیکلوپیڈیا میں اقبال کا تذکرہ ہے یا نہیں۔ تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے اقبال اقبال ہے اور انہیں اپنی عظمت یا اہمیت ثابت کرانے کے لیے کسی انسائیکلوپیڈیا کے مرتبین سے سند حاصل کرنے کی ضرورت نہیں!

ویسے جتنے بھی قابل ذکر جنرل انسائیکلوپیڈیا ملتے ہیں ان سب میں اقبال کا تذکرہ ملتا ہے حتیٰ کہ سوویت انسائیکلوپیڈیا میں بھی۔ ریاضی، اقتصادیات یا اس نوع کے دیگر مخصوص علوم کے انسائیکلوپیڈیا میں اقبال اس لئے نہیں مل سکتا کہ وہ محض ان علوم کے لئے مخصوص نہ تھے۔ ایک مفکر اپنے فکر کی روشنی میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور علوم کے بارے میں اظہار خیال کر سکتا ہے، اور یہی اقبال نے بھی کیا۔ انہیں دنیا نے عظیم مفکرین عالم میں ممتاز مقام دے رکھا ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کو فراق صاحب کے الفاظ میں نہیں مفکرین عالم کی صف میں خوش فہمی اور خوش اعتقادی کی بنا پر گھسیٹ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اقبال: محمدیت عام کے نام سے ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے جس میں سوویت ممالک کے علاوہ ایشیا اور مغرب کے ممالک کے ۲۴ اہل قلم کے ۲۶ مقالات شامل ہیں جن میں فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ بھی عظمت اقبال کے گن گاتے ہیں اس لئے اگر اقبال کے بارے میں کسی مصرع کی خوش فہمی یا خوش اعتقادی ہے تو وہ پاکستان کی حد تک نہیں بلکہ عالمی پیمانہ پر ہے اور اس خوش اعتقادی کے

---

[1] تقریر مطبوعہ اقبال ریویو کراچی اپریل ۱۹۷۷ء

فروغ میں ان کے اپنے ہم وطن جگن ناتھ آزاد نے بھی حصہ لیا۔ [illegible]
میں ایک ہندی خاتون [illegible] کام کر چکے ہیں [illegible]
[illegible] کام [illegible]
تنقید پیش کرنا ہے۔

[illegible] تنقید پیش کرنے [illegible]
سکتے ہیں کوشش یہ ہو [illegible] سمجھ سکتے ہیں [illegible]
کا [illegible] صرف [illegible] ہی کے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے
بھی ہے جو ابھی تک انسانیت کی تقدیر سے مایوس نہیں ہوئے۔

۱۹۲۰ء میں سکاٹش [illegible] کی تحریری [illegible]
جب تک اقبال سے دنیا کی دلچسپی میں کمی نہیں ہوئی اقبال کے [illegible]
اور [illegible] جیسے [illegible] شامل تھے [illegible] صاحب انگریزی کے [illegible]
وہ ان ناموں اور بالخصوص ہربرٹ ریڈ کے نام اور ان کی اہمیت سے [illegible]
یہ بھی واضح رہے کہ ۱۹۲۰ء میں اقبال صرف [illegible] ملک میں مقبول تھے [illegible]
حیثیت سے [illegible] بالخصوص دیگر دو اہل مغرب کے لئے ایک نئے اور جو میٹر شاعر سے روشناس
کرا رہے کچھ نہ ہو سکتے تھے لیکن ہربرٹ ریڈ جب نقاد [illegible] انگلستان میں خراج عقیدت
پیش کرتا ہے تو اس کی رائے کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے [illegible] خود [illegible] پر لکھتے
وقت اس نے اقبال کے بارے میں یہ کہا:

[illegible] میں [illegible] کے [illegible]
[illegible] کی [illegible] تو مجھے صرف ایک ہی ایسا زندہ شاعر نظر آتا ہے جو دعویٰ [illegible]

ثابت ہوتا اور یہ تو طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدہ اور عمل کا شاعر بھی نہیں ہے
میری مراد محمد اقبال سے ہے اور یہ کہ ہمارے تخلیقی مقتضا اپنے پیغمبر
جاپان کے حلقے میں ہیں کیلئے کیلئے ہیں تو بلوں دراصل ہی ہیں
موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے ہیں ہم سب ایک ہی سمت کی
کی نسلے جس نے رہے ہیں ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان
نسل میں ہیجان برپا کر دیا ہے ۔

اس بات کی میں فراق صاحب اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ مسئلہ اقبال ایک جزو
ب مسلمات کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں اور ان سے بھی چشم پوشی کرتے ہیں یہ پھر اقبال
کے کلام کی بنا پر ان سے کہ ۔ ہیں علامہ اقبال کی زندگی ہی میں اقبال
اور نطشے کے موازنہ کی طرح پڑ گئی تھی اور اقبال کے بعض اولین ناقدین اور بیشتر پروفیسر
ڈکنسن جنہوں نے دی ایجینیم ۱۹۲۱ء میں اسرار خودی پر تبصرہ کیا تھا نے بھی اقبال
کو نطشے سے متاثر قرار دیا تھا لیکن اس کی تردید میں اردو اور دیگر یورپین زبانوں میں
اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ فراق صاحب کے دوبارہ دی پرانا راگ الاپنے کی وجہ سمجھ میں نہیں
آتی سوائے اس کے کہ وہ یہ اعتراض کر کے اپنی دانست میں اقبال پر کاری ضرب لگا رہے ہیں کہ
اقبال کا سن گھمبیرت فلسفہ خودی یا بے خودی جرمن مفکر نطشے سے متاثر
ہے نطشے نے جرمن قوم کی دنیا کی تمام دوسری قوموں سے برتری اپنے

---

* مطبوعہ "دی ٹیلی گراف" ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء ۔ سر ہربرٹ ریڈ کے اس مضمون کا ترجمہ از راقم
"مضامین اقبال نمبر ۱۹۷۷ء اور اقبال ہمدست عالم میں شامل ہے ۔

فلسفہ فوق البشر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اقبال نے ملت اسلامیہ یا
اسلامی آبادی کے سر پر کاغذی تاج رکھ دیا ہے۔"

جو لوگ کاغذی تاج کو پاکستان سمجھتے ہیں ان پر یہ فرق صاحب کے لئے کافی ہو
تاج ثابت ہو گا اور بات ہے رہی فلسفہ خودی کی بات اور اس کا نطشے سے متاثر ہونا تو
سب سے پہلے تو خود علامہ اقبال نے ہی پروفیسر نکلسن کے نام اپنے خود کے انگریزی ترجمہ
کی طباعت کے بعد اپنے مکتوب میں اس اعتراض کو رد کیا تھا چنانچہ نکلسن نے اس
اعتراض کے جواب میں علامہ نے لکھا۔

میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل اسلام کے متعلق اپنے عقیدہ پر فلسفہ
لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نطشے کے عقائد کا علم میرے
شعور تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں۔ مغربی
کو چاہیے کہ میرے جذبات کا سمجھنے کے لئے جرأت منفکرانہ سے کام لے اپنے
ایک ہر وطن فلسفی کے افکار کو۔ جنہیں میری مراد سے کوئی مطلب نہ
اقبال نے گویا دعوت سے کسی کی ہوتی تو بھی نطشے اور اقبال کا غیر متعصب
تقابلی مطالعہ دونوں کے افکار میں اس کی فرق واضح کر دیتا ہے اسی لئے فرانس کے
تاریخ فلسفہ کے ماہر کلود ملیج CLAUDE MELLIGE نے اپنی کتاب
"INTRODUCTION TO THE THOUGHT IQBAL"
اقبال کا تعارف میں اس کی دو ٹوک الفاظ میں تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں

ل راقم نے اس کا اردو ترجمہ فکر اقبال کا تعارف کے نام سے کیا ہے

بعض ناقدین نے اقبال پر نطشے کے فلسفیانہ اثرات کے بارے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی زور دیا ہے۔ اس حد تک کہ گویا اقبال اس کا ایک ادنیٰ شاگرد ہو سکتا ہے یہ انداز نظر غلط ہے اور کوتاہ بینی پر مبنی۔

اس ضمن میں ہربرٹ ریڈ کی رائے بھی قابل غور ہے جس نے اپنے مجوزہ سمنوان میں نطشے کے تصور انسان کامل کو سراہتے ہوئے اقبال کو نطشے پر فوقیت بھی دی چنانچہ وہ رقمطراز ہے:

... نطشے کی سماجی اشرافیت کی جمہوری معاشرت پر استوار ہے جبکہ میری دانست میں اقبال کا تصور کہیں زیادہ پائیدار بنیادوں پر مستحکم ہے کہ اس میں مستقل حضرت مسیح اور حضرت محمد صلعم کی صورت میں جو مثالی شخصیات لی گئیں انہیں اپنی اصل میں کسی مخصوص سماج کا عطیہ یا پہلے سے متعین شدہ سمجھنے کے برعکس فطرت کی تخلیقی فعلیت کا اظہار قرار دیا گیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ مضمون کے اختتام پر ہربرٹ ریڈ نے امریکی شاعر والٹ وہٹ مین اور نطشے دونوں پر اقبال کو فوقیت دیتے ہوئے اس جذباتی آہنگ پر مضمون ختم کیا ہے۔

"نطشے اور وہٹ مین کے مقابلہ میں اقبال نے اس عداوت کا زیادہ یقینی طور پر احساس کیا ہے وہٹ مین کا "ربانی ادسولا" خاصہ مبہم ہے اور بطور ایک تصور اس میں توانائی کی شدت کا فقدان نظر آتا ہے جبکہ نطشے کا فوق البشر سماج کا باغی ہے لہٰذا جبلی طور پر جائے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہا ہے ... تمام آمادہ یورپین ناقدین یا افراد صاحب کے اپنے ہم وطن اور ہم مذہب کی پیشکش کی ہے ... یہ اعتراض نہ ہو کہ مسلمان پاکستان بنوانے جو پیا اقبال پر کر دیا ... چنانچہ اس نوشتے کے مصنف کو وطن اور مذہب سے آزاد ہو ... یا بیٹھے ... تو یہ کہنا ضرورت پر محسوس ہوتی کہ ڈاکٹر صاحب نے کہیں ... میں تو کہیں ... اقبال کو ... ہر مرحلے خوفزدہ ثابت کر کے ان کے ... میں اسلامی تصورات کو ... تعصب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ... اقبال کا ... ہو ... صاحب کو بہت کھٹکا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

"مصیبت تو یہ ہے کہ اقبال نے کئی موقعوں پر اپنے اسلامی عقیدوں کی خصوصیت اور برتری اور تنہا ان عقیدوں اور ایمانوں کو دنیا کی بربادی سے بچانے کا پیغام اور علاج سمجھ لیا ہے ان کے کلام میں امرت باقی نہیں ہے اور نہ معصوم آنسو جو ہمیں کالیداس، تلسی داس، سورداس اور میراں کے سنتوں اور فقیروں کے کلام میں ملتے ہیں۔"

اقبال اور بھگتی تحریک کے ان شعراء میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ اقبال اور ان کے شاعرانہ مقاصد میں اشتراک تھا اور نہ ہی ان سب نے یکساں نوعیت کے سیاسی سماجی اقتصادی حالات میں شاعری کی اس لئے ان شعراء کی مانند اقبال سے بھی معصوم آنسو کی توقع ہی بے جا ہے۔ اقبال نے ان ہی معصوم آنسوؤں کے خلاف تو فکری جہاد کیا تھا اقبال غلام ہند کو زندگی میں اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کے لئے عمل پیرا ہونے کے لئے جھنجھوڑ رہے تھے اس لئے ان سے یہ کہہ کر ڈوبی سند بنانا کہ توقع غلط ہے ان ہی کی مقاصد کی نفی تو ہے ... تمام سلام پرستی کے باوجود علامہ نے

مسلمانوں کے روایتی تصوف کو [illegible] کر دیا [illegible]
بیان کرنا سکھایا۔ اگر صوفیوں اور فقیروں کی [illegible] اقبال نے بھی اپنے اشعار [illegible]
[illegible] ہوتا تو [illegible] موتے فضل [illegible]
سب سے [illegible] کہ خالق پاکستان نہ ہوتے [illegible]
[illegible] ہوتے جن اقبال سے [illegible]
ملتی ہے اور افسوس کہ یہ [illegible]
[illegible] اقبال کی نظم [illegible] اقبال کے [illegible]
بنیاد روحانیت پر ہے اقبال دراصل [illegible] تصور ادب [illegible]
[illegible] روحانیت میں [illegible]
ضرورت نہ ہوئی

جہاں تک علامہ اقبال کے [illegible] ہونے کا تعلق ہے تو [illegible]
[illegible] تو [illegible] فخریہ [illegible]
[illegible] معذرت خواہی کی ضرورت نہ ہونی چاہیے [illegible]
کلوڈ تو اسی کو اقبال کا طرۂ امتیاز گردانتی ہے [illegible]
[illegible] پیش کیا جاتا ہے جو [illegible] اقبال [illegible]
[illegible] اقبال کے اعتراض کو آج سے چالیس برس قبل [illegible]
[illegible] ATTICIBATE کر کے اس کا جواب دیا:

[illegible] اقبال اور کشمیر ص ۱۰

[illegible] میرے [illegible] بہت سے انصافی کرتے
[illegible] کا طریقہ یہ کہ اس کے [illegible]
کو محدود کر دے یہ خزانے [illegible] فلسفہ [illegible]
[illegible] تعصب [illegible] کیا [illegible]

[illegible] مذہب [illegible] کا [illegible]
یہ کہ [illegible] مذہب [illegible] اس کے اثر کو [illegible]
[illegible] مذہب [illegible] سے اس کی [illegible] کی
اگر [illegible] کے بڑے [illegible]
[illegible] نظم [illegible] تو کوئی [illegible]
[illegible] عرض کرتا ہوں جو نظم متعلق [illegible]
[illegible] کے ہی دل پر [illegible] ہے؟

[illegible] اقبال کا [illegible] "[illegible]
نے [illegible] کیا [illegible] اس کے بعد اس نے [illegible]
[illegible] کی کتاب (TWO CHEERS FOR DEMOCRACY) [illegible]
[illegible] نے [illegible] اعتراضات بھی کئے ہیں لیکن وہ [illegible] کے
مذہبی رویہ کو ان الفاظ میں سراہتا ہے:

[illegible] مضمون کا ترجمہ سید سلیمان ندوی نے [illegible] "[illegible] ہندوستان
کے عنوان سے معارف، جون ۱۹۲۱ء میں کیا تھا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور خود اپنے کہے سے مکر کر یہ بھی کر ڈالا ہے کہ:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

مضمون کی ابتداء میں میں نے نزاع برپا کرنے والی [illegible]

[illegible]

[illegible]

"اردو کا جنم" (مطبوعہ ادبی دنیا" ۱۹۳۷ء) جیسے اہم موضوع پر لکھتے ہیں تو وہاں بھی اردو کے حوالے سے اپنے متعصبانہ خیالات کا اظہار کیا۔ شرر لکھنوی کے ساتھ ان کا تذکرہ منظر شروع ہوا تو اس کی بنیاد یہی وجہ بنی کہ یہ عربی اور فارسی الفاظ کو مستعار سمجھتے ہوئے اردو میں ان کے استعمال کے خلاف تھے اور ان کے برعکس سنسکرت اور ہندی الفاظ داخل کرنے پر زور دیتے تھے اور اب اقبال پر یہ مضمون لکھا ہے۔ وہی اقبال جن کے بارے میں ٹیگور کے یہ خیالات تھے:

"ہمارا ان چیزوں سے تعلق یہ ہے کہ اقبال دور کی یک جہتی پر اور سرمد اقبال کی دل کو مشتعل کر ایک دوسرے کے مقابل کر کے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ رویہ اس ادب کے متعلق ہوتا ہے جو انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلو سے بحث کرتا ہے اور اس طرح تمام ملکوں اور زمانوں کے شعراء اور اہل فن کو ایک بزرگی میں منسلک کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے مجھے یقین ہے کہ سرمد اقبال اور یہ ادب پر، صداقت اور حق کی خاطر کام کرنے والے دوست ہیں اور اجنبی کر یک ہو جاتے ہیں جہاں انسانی فکر پنہاں ہے یہ جاودانی بات کے حضور میں پیش کرتا ہے۔"[1]

---

[1] مکتوب بنام: ڈاکٹر محمد عباس خان، لمعہ مرقومہ ۲۰ فروری ۱۹۳۳ء مشمولہ: اقبال نامہ

اقبال کا لسانی شعور

"زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک لسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان لسانی خدمت کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔"

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے آشنا میں
کوئی دشت صحرا ہوتی جو یہ کہتا ناز کے سے

علامہ قبال نے اس خزانے سے ورثہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کسی حالت سے قابل توجہ ہیں۔ ان سے یہ قبال کے خیالات میں ورائی ہے کہ ان خیالات کی روشنی میں اگر ایک طرف علامہ کا لسانی شعور عیاں ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ وہ کسوٹی بھی مہیا کرتے ہیں جس پر خود علامہ کے اپنے کلام کی پرکھ ہو سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ قبال کے شعری محاسن کی تحسین کے لیے ایک نئی معیار بھی مل جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ خود قبال کے شاعرانہ وجدان کا عکس ہے جس کی اساس ان کا شعور نقد پر استوار ہے جس میں قبال کا لسانی شعور بھی رنگ آمیزی کرتا نظر آتا ہے۔

قبال نے گزشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں شاعری کا آغاز کیا اور موجودہ صدی کے آغاز

---

[1] "اقبال نامہ" مرتبہ: شیخ عطا اللہ ص: ۸۵

تک وہ برصغیر کے تہذیبی مراکز میں شمار ہونے لگے تھے۔ گزشتہ صدی کے آخری پچاس برس اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے سقوط کی صورت میں برصغیر سے مسلم سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہی نہ ہوا بلکہ اس سے ردِ عمل کی جس زنجیر نے تخریب کے نتیجہ میں مسلم تہذیب کی مستحکم قدروں میں دراڑیں پڑنے کے جس سلسلہ کا آغاز ہوا وہ آئندہ نصف صدی تک محیط نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد سے مسلم تہذیب و تمدن کی تاریخ لدے پانی میں ڈوبتے چاند کا منظر پیش کرتی ہے۔ برصغیر میں مسلم تہذیب کی زندہ علامات تھیں جیسے مغل سلطنت، اردو زبان، اردو شاعری، خصوصی طور پر غزل، عمارت جیسے تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، بادشاہی مسجد لاہور، مگر وقت اور تاریخ کے سیلاب نے دل اندکر کو اگر گرد و غبار بنا دیا تو موخر الذکر زندہ علامات کے برعکس بعض تاریخی عمارت بن کر رہ گئیں مذہب تمام، تمدن، اردو زبان اور اس کے شعری سرمایہ پر حتمی طور پر واقعی جی جان سے حفاظت کی گئی۔

اردو زبان و ادب کے دہلی اور لکھنؤ کی صورت میں دو بڑے مراکز تھے، جیسے دار جن کے اثرات برصغیر پر محیط تھے۔ زبان و ادب کے یہ مرکز لیونکہ دارالسلطنت تھے اس لیے ان شہروں نے تہذیب و تمدن، زبان و ادب و سیاست کے ضمن میں علامات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ کبھی یہ علامات روشنی کے میناروں کی مانند رہنمائی کا فریضہ ادا کرتی تھیں اور اپنے عصر میں زندگی کی زندہ لہروں کے مترادف تھیں۔ زندگی کی وہ زندہ لہریں جو قدرت عبارت ہوتی ہیں مگر ۱۸۵۷ء نے یہ سب خاک میں ملا دیا۔ دہلی دہلی نہ رہی اور لکھنؤ لکھنؤ نہ رہا۔ جبکہ جان جیسوں کے مقدر میں دہلی مرحوم کی مرثیہ خوانی رہ گئی۔ سرسید کی تحریک کا مرکز علی گڑھ بنتا ہے۔ جبکہ سرسید کے اہم رفیق اور تحریک کے سرگرم کارکن دہلی یا لکھنؤ

کے نہ تھے یا اگر تھے تو ان کی عملی زندگی اور ادبی کارناموں میں دہلی یا لکھنؤ نے اس کی کردار ادا نہ کیا۔

اس عہد کے ادبی اور لسانی تناظر کو سمجھنے میں یہ نکتہ بے حد اہم ہے، کیونکہ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدلتے حالات میں زبان و ادب کے قدیم مراکز اپنی اہمیت گنوا بیٹھے تھے جس کے نتیجہ میں علی گڑھ جدید تعلیم کا اور لاہور جدید ادبی تحریک کا مرکز قرار پائے تھے۔

محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کی صورت میں نظم نگاری کی جس تحریک کی داغ بیل ڈالی اور دہلی اور لکھنؤ میں اس کی جو شدید مخالفت ہوئی تو اس کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ وہ لوگ نظم کو غزل کی دشمن تصور کر رہے تھے۔ غزل دہلی اور لکھنؤ کی تہذیبی اقدار کی علامت تھی جبکہ آزاد کی نظمیں اور حالی کی نیچرل شاعری اس آخری قلعہ کو منہدم کرنے کی کوشش تھی۔

علامہ اقبال کی شاعری کے آغاز تک اگرچہ زبان و ادب کے بارے میں وہ شدید جذبات نہ رہے تھے لیکن اہل زبان میں اُردو کو صرف اپنی زبان اور خود کو اس کا جائز وارث سمجھنے کے رجحان میں البتہ کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے عصمتِ لسان کی محافظت کا فریضہ اپنا لیا۔ ایسا فریضہ جس نے انتہا پسندی کی صورت میں لسانی عصبیت کی صورت اختیار کر لی۔

زبان سے شدید جذباتی وابستگی کی کچھ نفسیاتی وجوہات ہوتی ہیں جن میں سرفہرست زبان کا زمین سے گہرا رابطہ ہے۔ دھرتی ماتا اور مادر وطن جیسے الفاظ پر غور کریں تو لسانی سائیکی سے ان کا گہرا نفسی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ اس حد تک کہ فرد انہیں ماں ہی کی

مانند عزیز جان کر ان کی عصمت اور طہارت کی حفاظت کرتا ہے۔ ماں اور [illegible] ان [illegible]
نفسی رابطہ ہے [illegible] کی کسی بات میں اور نسائی شخصیت میں کسی طرح کا شک [illegible]
ہے لیکن یہ سب موجودہ مضمون کی حدود سے خارج ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو اس
کی اس شدومد سے حفاظت کی جاتی ہے جیسے وہ ماں کا آنچل ہو۔ دھرتی ماں سے زبان
کی کا آنچل ہے وہ اس کا بیٹا ہے۔ اسی طرح باقی افراد بھی اس ماں کے بیٹے ہیں اور [illegible]
سب زبان کی عصمت کے نگہبان ہیں۔ لیکن جو باہر والے زبان کے [illegible] ہیں
اصل اندازہ کرتے ہیں وہ یہ کہاں ہوتے ہیں۔ ماں بیٹوں کے بیچ میں ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ تقریباً الفاظ میں وہ نفسیاتی رویہ جو اہل زبان اپنی زبان کی حفاظت سے یہ
اپنا تے ہیں [illegible] وہ ہندوستان کی سانی تجربات اور تجربات کو کبھی بھی [illegible]
رہتے۔ اہل زبان ہمیشہ زبان کو جیسی کہ وہ ہے اسے اسی صورت میں محفوظ رکھنے سے [illegible]
ہوتے ہیں [illegible] اہل زبان کا رویہ ہی درست تسلیم کیا جاتا ہے [illegible]
کے [illegible] کیوں نہ ہو اور کسی بیٹے طفل کے [illegible] بزرگوں کی سند [illegible]
بزرگوں کی سند [illegible] نفسیاتی اہمیت حاصل ہے۔ [illegible] ایسے ہے جیسے [illegible]
تو کی لیکن [illegible] یہ کہہ کر ٹال دیا کوئی بات نہیں ہم بھی ایسی ہی غلطیاں کرتے تھے۔
اہل زبان ناموس زبان کے قواعد کا احترام کرتے ہیں اور انہیں توڑنے کی کوشش نہیں کرتے
کہ یہ ایک طرح کی INCEST ہو جاتی ہے۔ اس نکتہ کی تشریح اس وقت ہوئی جب
میر امن دہلوی کی 'باغ و بہار' کی سادہ نگاری کے جواب میں مرزا رجب علی بیگ سرور
لکھنوی نے 'فسانۂ عجائب' لکھی۔ سرور کا یہ مسئلہ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے
محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعرانہ شہرت کے آغاز سے ہی ان کی زبان پر اعتراضات کا آغاز بھی ہو گیا تو اس کی بھی وہی نفسیاتی وجہ تھی یعنی اہل زبان کے نزدیک اقبال باہر والا تھا ایک طرح کا بیرونی حملہ آور جو مادر وطن کے آنچل کے درپے تھا۔ وہ آنچل میں ستارے ٹانک رہا تھا مگر ان کی ماں کے آنچل میں ستارے ٹانکنے کی جرأت کرنا تو دور وہ کون ہوتا تھا کہ آنچل اتارنے کے مترادف تھا اور ظاہر ہے کہ یہ ادبی حق اکتسابی تھا۔ لہٰذا اقبال کے خلاف اہل زبان کے غیض و غضب کو لسانی تعصب سمجھنے کے برعکس اس نفسیاتی نکتہ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ ان کے موجب اردو میں پنجابی الفاظ و محاورات استعمال کر کے اہل زبان کی حرمت کو مجروح اور اس کی طہارت کو آلودہ کر رہا تھا۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ بالکل ایسے ہے جیسے ماں کا غیر آدمی کے ساتھ ملاپ کرایا جا رہا ہو اور یہ INCEST سے بھی بدتر تھا اس لیے علامہ اقبال کے الفاظ میں اہل زبان اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو۔ حالانکہ زبان کا فروغ تہذیبی برتری کی نشانی سمجھا جاتا ہے (جیسا کہ انگریزی کی مثال سے عیاں ہے)۔

برصغیر کے مخصوص سیاسی حالات نے جب دہلی اور لکھنؤ کی مرکزی حیثیت ختم کر دی تو لاہور کی صورت میں ایک نیا ادبی مرکز جنم لے رہا تھا اسی وقت کسی کو یہ اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ آنے والے زمانے میں لاہور برصغیر میں نئی ادبی تحریکوں اور تصورات نو کا سب سے اہم مرکز بننے والا تھا یہ انجمن پنجاب کے مشاعرے ہوں یا مخزن ایسے ادبی مجلے، علامہ اقبال کی شاعری ہو یا ترقی پسند مصنفین۔ الغرض، بیسویں صدی کے پورے پہلے صدی تک برصغیر میں اردو ادب میں نئے خیالات اور تصورات کے فروغ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ

طور پر اہم اور فعال کردار ادا کیا ہے۔ اب یہ ناممکن تھا کہ لاتعداد پنجابی ادبی تخلیقات کرتے ہوں اور صرف وہ صرف اہل زبان کو مانیں اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ زبان کو یکسر بدل کر اہل زبان اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔

فرد اور اقوام کے ملاپ سے زبانیں بدلتی ہیں۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور محاورات و متروکات کے انداز بدلتے رہتے ہیں تبدیلی کا یہ عمل ایک فطری امر ہے۔ اس کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان اثرات کی جڑیں گہری ہو جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ یہ ایک اہم حقیقت کے طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کھپانے کی جو صلاحیت ہے وہ اس کی ساخت میں مضمر ہے۔ ان کے کسی وقت اور شعوری کاوش کے بغیر اردو میں نئے نئے الفاظ شامل ہو کر اسے متحرک اور لچکدار رکھتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد زبان میں نئے الفاظ کی شمولیت کا مطالعہ دو جہات پر کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف سرسید اور ان کے ساتھی شعوری طور پر اردو میں انگریزی الفاظ شامل کر رہے تھے جو بسا اوقات اپنے بھونڈے پن سے عبارت کا مزاج خراب کر دیتے تھے۔ دوسری طرف پنجاب کے اہل قلم تھے جو کسی مقصد یا منصوبہ بندی کے بغیر صرف تخلیقی سطح پر اردو میں پنجابی الفاظ، محاورات اور لہجہ شامل کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ یہ انداز سرسید اور ان کے ساتھیوں کی مانند نہ تھا جو قومی سطح پر پھیلے احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے انگریزی الفاظ کی اردو میں شامل کرتے تھے۔ جبکہ پنجابی اہل قلم تخلیقی تقاضوں کی بنا پر ایسا کر رہے تھے۔ علامہ اقبال اس کی نمایاں ترین مثال قرار پاتے ہیں اور ان ہی پر سب سے زیادہ اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں۔ اقبال نے اس نوع کے اعتراضات کا جواب اپنے ایک مضمون اردو زبان پنجاب میں دیا ہے۔ علامہ نے اس مضمون میں خود کو ایک منصف مزاج پنجابی قرار دیتے ہوئے اس امر پر تعجب کا

اظہار کیا ہے کہ اہل زبان اردو زبان میں تبدیلیوں کے عمل کو روکنے کے کیوں درپے ہیں۔ علامہ اقبال علم لسان کے ماہر نہ تھے (بلکہ مخالفین کے بموجب تو وہ اُردو کے بھی ماہر نہ تھے) لیکن اس کے باوجود علامہ نے زبان میں تغیرات کی منطق کو جس طرح سے سمجھا ہے، اس کی اساس ان کی اپنی تخلیقی حسیات میں ہی تلاش کی جا سکتی ہے۔

علامہ اقبال رقم طراز ہیں:

..... اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے ہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے جو زبان جو باتمام وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطلب پر قادر ہو اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے جو زبان ابھی بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، اردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا، اور کیا تعجب کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلّم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں

نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ [1]

[illegible] لسانی عصبیت کا پیدا ہونا ہے [illegible] تہذیبی خصوصیات [illegible] کے اختلاف [illegible] کسی چیز [illegible] کو دیوالی بنانے کے [illegible] بھی ہیں [illegible] ملکی تہذیبی اختلاف کے نتیجہ میں زبان میں تبدیلیوں کے [illegible] تھے اسی لیے جب وہ متذکرہ مضمون میں یہ لکھتے ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔

"تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیوم وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے [illegible] کے لفظی ترجمے کو جو تکلف استعمال کرو، لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی بے معنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باقی باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منظور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح خلاف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی ذی بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس

---

[1] : "مقالات اقبال" سید عبد واحد معینی ص : ۲۰

سے اُردو الفاظ و محاورات اخذ کیے جائیں تو آپ کا عذر بے جا ہوگا۔ اُردو
بھی کہاں کی علمی زبان بن سکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش،
بازار، بوٹ، چالاک وغیرہ لے لیے ہیں اور یہی روز بروز سے رہی ہے۔
علامہ اقبال نے کسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار پیش کیا ہے اور مضمون قومی زندگی
کا بھی کیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے قومی زندگی میں قومی تقاضے کے تحت
زبانوں کی نشوونما اور موت کی اصول کی تشریح کی ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:

... ایک زمانہ تھا جب یونانی یا لاطینی و سنسکرت وغیرہ زبانیں تھیں مگر اب ان
سے یہ زبانیں بے جان ہو چکی ہیں ان کی موت کا راز اس قانون کا عمل ہے اور خود
پنجابی زبان جس کو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں اس سے روز بروز متاثر ہو رہی ہے۔
سینکڑوں الفاظ ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے روزمرہ استعمال میں ہیں مگر اس زبان
میں موجود نہیں۔ یہ زبان ان کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ایسے حالات میں یہ لازم
ہے کہ اس زبان کا حشر وہی ہو جو اور قدیم زبانوں کا ہوا ہے۔ [1]

ان اقتباسات سے علامہ اقبال کے لسانی شعور کا اندازہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ امر بھی واضح ہو جاتا
ہے کہ وہ اُردو میں پنجابی الفاظ کی شمولیت کو جائز اور درست سمجھتے تھے۔ لیکن ان خیالات کی روشنی میں
علامہ اقبال کے کلام کا جائزہ لینے پر وہاں کا لسانی منظر ان شرپاروں کے برعکس نظر آتا ہے۔ علامہ نے
جیسی معرّبی اور معرّب شاعری کی اُردو کے اور کسی شاعر نے نہ کی ہوگی۔ حتیٰ کہ غالب نے بھی نہیں۔
بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فارسی رنگ آمیزی کے جس مقام پر غالب نے شاعری کو چھوڑا تھا، اقبال

---

[1]: "مقالات اقبال" ص: ۴۳

نے وہاں سے آغاز کیا اور آیات کی تضمین کی صورت میں سے اس کی منطقی انتہا تک لے گئے۔ ابتدا میں شاید پنجابی انداز ہو لیکن بعد میں اقبال اس سے بتدریج دور ہوتے گئے۔ یوں دیکھیں تو عورت کے نسائی شعور اور اس کے شاعری میں اظہار میں بُعد نظر آتا ہے۔ اور یہی ہر سے اس کی بنیادی وجہ پیغام کی کرب باری تھی۔ اقبال جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کے لیے اردو زبان کا مزاج ساتھ نہ دیتا تھا اس لیے وہ عربی فارسی کے مانوس اور غیر مانوس مرکبات کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ یہی نہیں بلکہ جیسے جیسے اسلام کی طرف ان کا رجحان بڑھتا چلا گیا ویسے ویسے ہی سوانحی، تاریخی، تلمیحات اور قرآن مجید کے حوالوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

اس کے برعکس فارسی کلام میں علامہ کی سادہ بیانی، سہل ممتنع کی حد تک خیالی نشاط آتی ہے۔ اقبال کے لیے وہ غیر زبان تھی مگر اس میں اقبال نے اہل زبان کا سا ذوق پیدا کر دکھایا۔ اس حد تک کہ اب فارسی تنقید میں سبک اقبال نے ایک جداگانہ اصطلاح کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن اردو میں عدم عاجز سے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے وہ اظہار مطلب کے لیے فارسی و عربی پر انحصار کرتے ..... ہیں اب یہ اقبال کی فنی ریاضت کا اعجاز ہے کہ انھوں نے غیر مانوس الفاظ کو اس سلیقہ اور فن کاری سے برتا کہ وہ بھی اردو کا جزو بن گئے۔

جزو، کل اور اقبال

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

یہ اور اس انداز کے دیگر اشعار خاصے مشہور ہیں کہ ہر نوع کے لیڈران کرام اور ہر نکتہ نظر کے ناقدین انہیں وقتاً فوقتاً اپنے مخصوص مقاصد کے تحت استعمال کرتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے لیکن بیشتر صورتوں میں یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ یہ اشعار کن نظموں سے لئے گئے ہیں، ان کا سیاق و سباق کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فکرِ اقبال کے مجموعی تناظر میں یہ کس ذہنی رویے کے مظہر ہیں۔

مختصر ترین الفاظ میں قائد اعظم کی ماہیت بیان کرنی ہو تو اس کے لئے میں
سنت کی حدیث کا لفظ موزوں ترین ثابت ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے خطوں
[illegible] مسلمانوں کے لئے بے لفظ [illegible] مشکوک [illegible]
ہیں تو خوفناک [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible]
[illegible] اور [illegible] کا ایک [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] کے نام [illegible]
[illegible] کے لئے [illegible] تھے [illegible] اور [illegible] کی صورت میں
[illegible] کے [illegible] عمل کو جاری کرتے ہوئے [illegible]
[illegible] وہ [illegible] فکر [illegible] حدیث [illegible] ان [illegible] کی [illegible]
[illegible] ماضی [illegible] کی [illegible] صورتیں [illegible] ایک [illegible]
[illegible] ہے۔ اس سے [illegible] قائد نے وطن کو سیاسی تصور کے [illegible]
مسترد کر دیا۔ [illegible] میں یہ مسلمانوں کو مخصوص جغرافیائی حدود کی قیود میں محدود
کرنے کے مترادف ہے جبکہ وہ اسے صورت ماہی آزاد دیکھنا چاہتے ہیں

جو قید مقامی تو تبلیغ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

(نظم وفیت)

علامہ اقبال فرد کی خاک وطن کے دیوتا کے حضور سجدہ ریزی پسند نہیں کرتے اور کیوں کریں وہ تو انسان کے لئے تقدیر کی پابندی بھی گوارا نہیں کرتے کہ تقدیر کے پابند نباتات و جمادات! لہٰذا انسان، گر وطن کا پابند ہو گیا تو اس نے خود کو ایک کمتر تقدیر کے حوالہ کر دیا۔

اس ضمن میں یہ سوال اساسی اہمیت رکھتا ہے کہ وطن کیا ہے؟ یہ جغرافیائی حدود سے عبارت ہے کہ طرز حکومت سے، سیاسی عقائد سے، اس کا کیا تعلق ہے، وہ مذہب اس کی تشکیل میں کیا کردار ادا کرتا ہے کہ یا پھر یہ سب فراموش کر کے وطن کو محض فرد، افراد، فرد، معاشرہ اور معاشرہ، قوم کی ریاضیاتی مساوات کے متردف جانا جائے۔ یہ سوالات اس بنا پر اہم ہیں کہ وقتاً فوقتاً بولوں سے ان سب کی نظریہ ہائے وطن جہاں وہاں ..... کی قومیاں دی ہیں۔ ان سب کے نام پر جانیں لیں بھی دیں بھی۔ ان کے پیش نظر فرد اور معاشرہ کا رابطہ بذات خود اتنا اہم مسئلہ نہیں رہتا کہ یہ ان بڑے اور بنیادی مسائل کی ذیل میں آجاتا ہے۔ علامہ تمام فرد اور معاشرہ دونوں کو خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کی دانست میں اپنی انفرادی حیثیت میں یہ ... دیا کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ علامہ زندگی، اس کے مختلف اور بعض اوقات تو متضاد مظاہر کو ان کی ظاہری اور سطحی حیثیت میں قبول نہیں کرتے بلکہ برعکس انہیں زندگی کے ایک کلی تصور کے تابع دیکھتے ہیں وحدت نہیں کا یہ تصور اپنے اندر ایک جہان ممکنات بھی رکھتا ہے اور فرد اور معاشرہ سے باہمی روابط سے وابستہ مضمرات بھی۔ علامہ کے سامنے زندگی ایک وسیع Mosaic کے روپ میں تھی اور انہوں نے تنوع کی رنگا رنگی کو اس کے انفرادی روپ میں دیکھنے کے

برعکس ان سب کے مجموعہ سے تشکیل پذیر ہونے والے تاثر کو ملحوظ رکھا اس لیے وہ فرد کو افراد پر، افراد کو معاشرہ پر، معاشرہ کو قوم پر، قوم کو وطن پر اور وطن کو ملت پر ترجیح دینے کو تیار نہیں کہ وہ محض ایک مسلمان یا کسی خطہ کے مسلمانوں کے شاعر نہیں بلکہ ملی وحدت کے رشتہ میں منسلک تمام مسلمانوں کے شاعر ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا؟ ہے خدائی!

وحدت افکار جب ہو مرکز سے کیا رابطہ؟ وحدت کے نقطہ نظر سے دوسرے کے ساتھ ملنے کا جواب مشکل نہیں بنتا۔ وحدت افکار کی اساس اسلام پر استوار ہے تو مرکز اسلام کی منظور ہستی کا نام ہے

جمعی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

آخری مصرع میں جمعیت اور ملت قابل غور ہے۔ ملت ایک دین کل ہے

سمندر ہے جس میں جمعیت، قوم، معاشرہ، افراد اور فرد سب ندی نالوں کی طرح آکر سما جاتے ہیں اور جزو اپنے سے بڑے کل میں شمولیت سے نہ صرف اپنی بقا کا تحفظ کرتا ہے بلکہ اس کل کے لیے بھی باعثِ تقویت بنتا ہے۔ اس کے بعد یہ کل خود سے بڑے کل کے لئے جزو کا کام کرتے ہوئے اس میں سما کر اپنی انفرادیت تج دیتا ہے مگر خود سے بڑی انفرادیت میں سما کر منفرد ہو جاتا ہے یوں دیکھیں تو فرد معاشرہ کے کل میں معاشرہ قوم کے کل میں اور قوم ملت کے کل میں جذب ہو جاتی ہے، ہر قطرہ بحر بیکراں تو ہے مگر ساتھ میں یہ بھی کہ:

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

علامہ اقبال کے فلسفہ میں ملت کے وسیع سمندر میں جب قوم اور معاشرہ موج ہو جاتی ہیں تو پھر فرد قطرہ سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟ علامہ نے جب ملت کے لیے وحدتِ افکار کی اساس مہیا کی تو بہت گہری بات کی، کہ وحدتِ افکار، وحدتِ مقاصد سے جنم لیتی ہے یوں ملت، قوم، معاشرہ، افراد اور فرد سب اس وحدتِ مقاصد کی ڈور سے بندھے ملتے ہیں اور اسی سے حصولِ مقاصد کی خاطر اپنے اپنے طور پر فرد، فرد معاشرہ، اور قوم اپنی منفرد حیثیت چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اندازِ نظر، اپنی اساسی حیثیت میں اشتراکی رویہ سے مشابہ ہے، وہاں بھی ریاست کے وسیع تر مفاد کی خاطر فرد اپنی انفرادیت کی قربانی دیتا ہے۔ اقبال ایک مقصد پسند شاعر اور عمل پسند مفکر تھے اس لئے انہوں نے مغربی انداز کی انفرادیت پسندی کو کبھی بھی پسند نہیں کیا کہ ایسی بے سروپا آزادی علامہ کے مخصوص تصورِ ملت کے منافی تھی، انہوں نے ملت کی سربلندی کے لیے جن اجتماعی مقاصد کو مسودمتد جانا ان کی تکمیل میں آڑے آنے والوں کو وہ ناپسند کرتے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن

ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

ان دونوں مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ نے یہاں بھی مردِ مومن اور مجاہد کی صورت میں فرد کو اس کی انفرادیت یا داخلیت میں جینے کے بجائے اس کی ذات و افعال سے وابستہ اجتماعی مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ محض فرد اور معاشرہ کے تصور کی تشریح بے سود ہے کہ اقبال نے وحدتِ ملت کے ایک وسیع کل کی جن اجزاء سے تشکیل کی ہے فرد ان میں سب سے زیادہ غیر اہم ہے ..... ہوتا ہے، سمندر میں ایک قطرہ کیا وقعت رکھتا ہے، وہ لاکھ چیختا رہے کہ میں بحرِ بے کراں ہوں، میں سمندر ہوں وہ رہے گا تو ایک قطرہ ہی! قطرہ کا المیہ یہ ہے کہ بہتے دریاؤں کے پاس قطرہ میں وجود دیکھنے کی بصیرت نہیں ہوتی۔

(۲)

جزو اور کل کی تدوین میں دراصل شخصی آزادی اور سماجی آزادی کا مسئلہ بن جاتا ہے علامہ اقبال نے جہاں خودی کے تصور سے جزو کو اپنے محدود وجود سے ماورا ہونے کی تلقین کی وہاں بے خودی کی صورت میں اسے کل کے لیے ہم آہنگی کے انداز میں مجاہدانہ یوں خودی اور بے خودی دونوں کو انسان کی باطنی اور خارجی زندگی کا جزو بنا کر تکمیل کرتے ہیں یہ فلسفۂ اقبال کی معتدل روش کا اعجاز ہے کہ انہوں نے جزو کو محض جزو ہی نہ رہنے دیا اور اسے کل پر محیط ہونے کی ..... تلقین بھی کی وہ خودی کی بے خودی کے بغیر تکمیل کے خواہاں نہیں!

جہاں تک آزادی، شخصی آزادی، سماج اور سماجی ذمہ داریوں جیسی اصطلاحات

[illegible] تو ان سب سے مخصوص مفاہیم وابستہ نظر آتے ہیں۔ آزادی [illegible]
خاصہ قوت ہے۔ اس لئے مختلف مذاہب میں آزادی کا تصور [illegible]
کا نہیں جو کہ خالص مغربی طرز معاشرت بلکہ زیادہ [illegible]
تصور کی ضمنی پیداوار ہے۔ [illegible] آزادی تو بنیادی طور پر خیر و شر میں سے [illegible]
ہے اسی لئے آزادی کا تصور کسی نہ کسی طور پر مذہب سے وابستہ نظر آتا ہے۔
مغربی تصور آزادی کے دائرہ میں مذاہب عالم میں اس کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔
[illegible] زیادہ [illegible] ہماری وہ صورتیں ملتی ہیں جن کے ذریعہ آزادی [illegible]
بعد [illegible] صورتوں کی تشکیل کرتے آزادی کو [illegible]
یوں دیکھیں تو آزادی کا [illegible] منفی پہلو نظر آتی ہے [illegible]
[illegible] تو معاشرہ پر عائد ہوتی ہے۔ جیسے [illegible]
[illegible] فرد کو خواہ مخواہ ایک دائرے میں محدود کر دیتا ہے [illegible]
[illegible] مذہب عالم [illegible] آزادی [illegible]
[illegible] آزادی کا مذہب [illegible] جنموں کے بارے میں [illegible]
[illegible] لوگوں نے وحشی معاشروں کے بارے میں جو معلومات [illegible]
ہیں وہ ان کے انتظام، اخلاق کے بارے میں بھی [illegible]
[illegible] معاشرہ [illegible] صورت [illegible]
[illegible] تصور [illegible]
[illegible] وہاں کسی [illegible]
[illegible] قدر [illegible]

عہد کے وحشی اور غیر متمدن سے لے کر آج کے مہذب اور تعلیم یافتہ افراد تک کسی کو بھی
لے لیں سب میں آزادی کی اساس پابندیوں پر استوار نظر آنے لگی، بالفاظ دیگر منفی سے
مثبت کا تصور ابھارا جاتا ہے۔

یہ منفی کیا ہے؟

معاشرہ! یہ ہر نوع کی قدغن جو معاشرہ اقدار کے نام پر عاید کرتا ہے کسی لئے تو فرد
کو جو آزادی بہت آزادی حاصل ہوتی ہے وہ اسے کسی نہیت یہ بھی یہ تو ہے جیسے بات
دیتا جذبہ لیکن اگر اس تو اسی آزادی کی آزادی کے حصول کے لئے وہ اور کئی امور کی صورت
میں بھی قیمت بھی ادا کرتا ہے اور یہ سب اس لئے کہ وہ معاشرے سے خود کو منقطع کر
نہیں کر سکتا معاشرہ بھی فرد کو بہت کچھ دیتا ہے لیکن ان سب سے تحفظ کا احساس اور شناخت
یہ جس احساس تحفظ کو فرد کی بنیادی حاجت کی تسکین کرتا ہے تو شناخت اسے اپنے ہونے
کا یقین دلاتی ہے یہ شناخت جب شخصی سطح پر فرد یہ تو ذہنیت اور اس سے وابستہ دیگر
نفسی کیفیات کا جنم ہوتے ہیں جب اجتماعی سطح پر فرد معاشرہ کی صورت میں کیا یہ
سیاق و سباق عمل میں آتا ہے جہاں دیگر افراد سے آمیزش کے بعد وہ اپنی شناخت کرتا ہے یہ
نکتہ بہت اہم ہے اور اجتماعی نفسیات کے کئی اہم مسائل سے وابستہ ہے۔

نقطہ یہ ہے کہ وہ تحفظ جس میں فکر و عمل میں جمود کا فرد معاشرہ
یا فرد کی شخصی آزادی اور معاشرتی فرض کے درمیان جیسے اہم مسائل کا سامنا کرتا ہوا

علامہ اقبال کے نظریہ میں ایک بات تو طے ہے کہ وہ اپنے عہد کی مادہ پرستی
فرد کو تنوع بات ہے لیکن اساسی مانند قرآن مجید سے یا ہو [illegible] اور دوسرے
کی مثنوی کو تو خود قرآن [illegible] کہا گیا ہے [illegible] علامہ اقبال کی عظمت اس

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

امر میں ہے کہ انہوں نے تنگ نظری کی مانند آن مجید کی کوئی تعبیر کی بجائے اس کی صحیح
کو مدنظر رکھا، جن کے فوائد کو قوت کو مسترد کیا

سید دین نصرت اس نے اسلام کی دو حصہ ہب جنہیں نے اسلامی معترض
کیے کہ متعین کی بجائے تو اسلامی صورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حمایت
اسلام کا اس کا حصہ درجنس کے ساتھ دیتے ہیں کہ آپ ہوتے ہیں کہ
کو تو نظر دی سطح پر حضرت عمر کا آئیڈیل بنانے کی کوشش کی گئی یعنی ایک تحریک مردوں
کے لئے کہ ستے کاں کے کہ درست جتنی سطح پر حکومت کی طرح قومی دائرہ قومی تک
تو صلاحیت پر خود اس کے پیروں کو فوقیت دی جا چکی ہم نظر کو سر تھوک کے ساتھ
کے حصے میں بات سننے کی حمایت دی تو صلح کر دیں۔ قاضی دستخط شمس میں قرآن پیش ہوں
بننے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

سینٹ یوں MARRY THEN [illegible] باقی جبکہ سلامت نسل سے
کے فروغ کی اہم تر یہ بات کہ سات درقوت کو تسلیم کرتے ہوئے مخصوص حالات کے مطابق
چار تک شادیوں کی اجازت دی ہے جس کے حقوق اور اسلام دلو ہی کی صورت میں فساد کو بھی
بھی کر دیا۔

سنا آپ [illegible] حق کی [illegible]
قلب میں گرمی شوق پیدا ہو جائے تو [illegible] کیا جا سکتے [illegible]
کتب ترک کر [illegible] ہوں اگر کبھی کچھ جانتے ہوں تو صرف [illegible] شوق دلایا

(علامہ اقبال بنام حکیم محمد حسین عرشی ۱۹ مارچ ۱۹۳۴ء)

اب تک جو کچھ محدود اور فرد کی آزادی کو پابند کرنے والے جن امور کا ذکر کیا گیا یہ سب کے سب اپنے ماخذ سے قطع نظر ماحول نوعیت کے ہیں اور ان کی نفیت درحقیقت انسانی شخصیت میں ثبات پیدا کرنے یا اسے مزید تقویت دینے کے مختلف انداز قرار دیئے جا سکتے ہیں لیکن تقدیر کی صورت میں انسان خود کو جس طرح پابند محسوس کرتا ہے وہ جداگانہ نوعیت کی بحث بن جاتی ہے تقدیر اپنی اساس میں تو انسانی ہے مگر زمین کے باشندوں کو متحد کرتی ہے انسانی زندگی میں بیشتر پابندیوں محدودیوں اور محرومیوں نصیبوں کا جو نہ تقدیر سے جھیلا جاتا ہے اس سے تقدیر کی تازہ حیرت جنم لیتی ہے تو کبھی زخموں کا سہارا کبھی اپنی حسرت کا مداوا تو کبھی غیر مستحق کی عشرت کا جواز کسی کیلئے زہر بنتی تو کسی کیلئے نیوت۔

علامہ اقبال تقدیر پرستی کے مضر نتائج سے بخوبی آگاہ تھے وہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر قومی زندگی کے لئے اس کی مضرتوں سے آگاہ تھے پیر و مرید میں مرید کی حوصلہ شکنی

است شریک مشتی خاصان پدر — من نہ بیں سجھا حدیث جبر و قدر

اس پر پیر رومی یہ جواب دیتا ہے۔

مال یزداں را سوئے سلطاں برد — بال زاغاں را بگورستاں برد

ضرب کلیم کی ایک نظم بعنوان حکیم میں بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے

یہ مسئلہ تقدیر کہ یا مبرم احکام — یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر — ہے اس کا مقدر کبھی ناخوش کبھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

نباتات میں انسانوں کی مانند نمو کی صلاحیت اور نشوونما ممکن ہے لیکن یہ نمو اور نشوونما خود کار اور فطرت کے متعین کردہ نظام کی مرہون منت ہوتی ہے جبکہ انسان کی فعالیت اس کے خود مختار ارادے سے جنم لیتی ہے یا اقبال کے بموجب اسے جنم لینا چاہیئے مدعا اقبال کے تصور تقدیر کی رو

[illegible] جمادات کی یہ تقدیر ہے کہ وہ خود سے حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ [illegible] کا مقدر یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی پر بھی قادر نہیں۔ زمین [illegible] جاتی ہیں ان کی تقدیر [illegible] بالکل اسی طرح [illegible] کے یہ قوانین ان کی تقدیر ثابت ہوتے ہیں [illegible]

[illegible] تقدیر سے آزادی، محدود قوت کا [illegible] تقدیر سے آزادی [illegible] محدود آزادی میں [illegible] ہے یہی بے گیا یوں آزادی [illegible] کی صورت میں بے مقصد آزادی ہو سکتی [illegible] ہی کی صورت میں کسی روک کی [illegible] آزادی ہو سکتی ہے [illegible] اور یوں یہ آزادی جو [illegible] بن سکتی ہے۔

علامہ مغربی [illegible] فرد کی تقدیر [illegible] سے [illegible] حادث کو [illegible] اہمیت نہیں دیتے [illegible] کے پیش نگاہ [illegible] قومی وحدت تھے [illegible] کا تعلق بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی سرفرازی [illegible] تھا چنانچہ [illegible] کی مختصر تقدیر میں فرد اور قوم کے لئے تیوذ تقدیر کو یوں اجاگر کرتے ہیں

نادان کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت ۔۔۔ ہے خود [illegible] میں کبھی جوہر ذاتی
شاید کوئی مشق جو بہاں سکے عمل میں ۔۔۔ تقدیر نہیں تابع منطق [illegible]
ہاں ایک حقیقت سے کہ معلوم ہے سب کو ۔۔۔ تاریخ [illegible] جس کو نہیں قوت [illegible]
ہر لمحہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی ۔۔۔ [illegible] صفت [illegible] کی

علامہ اقبال [illegible] خودی کی صورت میں [illegible] حیات [illegible] کی تشریح و توضیح [illegible] کچھ کہا ہے کہ اس ضمن میں مزید [illegible] تشریح [illegible]

اس کہا جا سکتا ہے کہ فکرِ اقبال میں خودی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو نظامِ شمسی میں سورج کو جس طرح سیارگان اپنی آزاد رفتار بلکہ خود کا گردش کے باوجود سورج کی کشش کے تابع ہیں اس حد تک کہ ان کی گردش کا مدار بھی اس سے طے پاتا ہے تو اسی طرح علامہ اقبال کے بیشتر محبوب تصورات جیسے عشق و عقل مردِ مومن وغیرہ بھی اپنی اساس میں خودی کے مرکزی تصور سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

خودی کیا ہے؟

خودی خود شناسی ہے یہ عرفانِ ذات ہے اور شعورِ ذات بھی۔ اس کا بنیادی مقصد فرد کو اندیشۂ امروز و فردا اور بیم و رجا سے آزاد کرنا ہے علامہ اقبال نے خودی کے مقاصد خاص کو جس طرح اجاگر کیا اس سے یہ بے پناہ توانائی پیدا کرنے والی چیز بن جاتی ہے دینی فکر میں خودی کی توانائی کی متعدد اور تصورات بھی ملتے ہیں ایک برگساں کا قوتِ حیات (ELAN VITAL) اور دوسرا فرائڈ کا جنسی توانائی (LIBIDO) کا۔ لیکن یہ دونوں تصورات اقبال کی خودی کے متوازی یک رخ اور یک جہتی معلوم ہوتے ہیں برگساں کی قوتِ حیات ترتیب و تنظیم اور مقاصد علیے سے بھی تہی اور تنہا میں ایک آندھی اور بے مہار قوت ہے جبکہ لیبڈو نفس پر استوار رہنے اور شعور کی معمول جبلتوں میں گم۔ خودی ان کے برعکس کثیر الجہت ہے خودی ذات سے تو جنم لیتی ہے لیکن کچھ شرائط کے ساتھ ایسی شرائط جو اسے محض (ELAN VITAL) بنانے سے باز رکھتی ہیں اور فرد اور جماعت کی زندگی میں اس کی تخلیقی فعالیت کا کردار متعین کرتی ہیں علامہ کو بھی اس امر کا احساس تھا کہ خودی کی صورت میں جو قوت وہ انسان کو دے رہے ہیں وہ کبھی اسے ضرورت سے زیادہ آزاد بنا سکتی ہے اقبال فرد کو آزادی تو دیتے ہیں مگر وہ اسے باغی کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے تو یہی وہ اساسی نکتۂ نظر ہے جس سے مردِ مومن اور فوق البشر میں امتیاز پیدا ہوتا ہے اقبال کا مردِ مومن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں خدا کی حاکمیت کا اعلان کرتے

ہوئے بندگی کے آداب بجا لاتا ہے جبکہ فوق البشر خدا کی موت سے اپنی آمد کا اعلان کرتا ہے
نطشے اس اہم حقیقت کو فراموش کر بیٹھا کہ خدا کی موت کی صورت میں ایک ایسا محسوس خلا بھی
ختم ہو جاتا ہے جس کے منطقی نتیجہ کے طور پر انسان ہی فوق البشر بن کر خود خدا بن جاتا ہے جب
اقبال نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ فرد مرد مومن ہے کی صورت میں تکمیل ذات سے
جو مراد لیتا ہے، وہ ذات جو جلیل و جمیل ہے اسی لئے وہ اس کا مطلب ہونے کا
محسوس کرتا ہے۔

اس فکری پس منظر میں فرد کی آزادی اور اس کے دیگر مسائل کے بارے میں
اقبال کا رویہ واضح طور پر سامنے آتا ہے یعنی وہ انسان کو اس کی فطرت میں معرفت ذات
تو ممکن ہے لیکن جائز حدود کے اندر اور صرف مرد مومن کی حد تک ہی وہ اسے
دیتے ہیں کوئی رکاوٹ نہیں اس لئے نہیں کہ انسان کے خدا بننے سے خدا کا تصور
وہ مکمل انسان ہے کی حد تک ہی حیات و کائنات کے مسائل کے حل
رہ جاتا ہے۔

اس سارے مشاہدہ سے یہ حقیقت ثابت کرنا ضروری ہے کہ وہ کلی حل پوشیدہ ہے
کیونکہ خدا بول کل ہے اس کے متعلق کل کے متعلق ہی حرکت کرتا رہتا ہے۔

اقبالؔ اور ہمارے فکری رویّے

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

یہ ہیں اشعار فکرِ اقبال کی جن جہات کے عکاس ہیں ان میں اندیشۂ دانا کی جنوں آمیزی اور پھر جنوں کا حرفِ راز سکھانا کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور اس جنوں پر مبنی دانائی سے جب علامہ کی غزل پرسوز و نشاط انگیز ہوئی تو حریمِ ذات سے شور اٹھا اور بتکدۂ صفات میں غلغلہ ہائے الاماں بلند ہوا۔

علامہ اقبال کی یہ ایک بہت اہم خصوصیت ہے کہ اگرچہ انہوں نے مختلف وقات میں انداز بدل بدل کر اپنی شاعری اور اس سے وابستہ خصوصی مقاصد پر روشنی ڈالی لیکن

ہمارے قدیم اساتذہ کی مانند تعلق سے کام نہ لیا۔ تعلق اور تعلق پسند شاعر کی اپنی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے جس کی تشکیل میں زمینت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن علامہ نے جس قوی فلسفے، ملی تصورات اور جس مذہبی انتشار کے لیے اپنی شاعری کو وقف کر رکھا تھا، بحیثیت مجموعی جس کا ادبی نصب العین حقائق سے وابستہ فکری اور فنی تقاضوں کی تعمیل سے وابستہ سطحی جذباتیت سے ہم آہنگ نہ ہو سکتی تھی یہ ان نفسیاتی دلچسپی کا حامل نہ کرنے سے داغ کی مانند اقبال نے تو زبان دانی کا بھی دعویٰ نہ کیا۔

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے آشنا میں
کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی!

اقبال ایسے شاعر کے لیے زبان دانی کی کوئی اہمیت نہ ہو سکتی تھی کہ انہوں نے کبھی بھی خود کو روایتی معنوں میں نہ تو شاعر سمجھا اور نہ کبھی معاصر شعرا کی بھیڑ میں شامل ہونے کی خواہش کی۔ ہر چند کہ لسانی شعور اور شاعری کے فنی محاسن سے آگہی میں وہ کسی سے کم نہ تھے۔

علامہ بنیادی طور پر فلاسفر تھے اور قوم کو بھی انہوں نے فلسفہ ہی دیا۔ زندگی سمجھنے کا فلسفہ، زندگی پرکھنے کا فلسفہ اور زندگی بسر کرنے کا فلسفہ۔ لیکن اپنے فلسفیانہ افکار کی ترسیل میں بھی علامہ کا رویہ زبان سے آشنا میں سے مشابہ نظر آتا ہے اس لئے بہت کچھ لکھ پڑھ کر اور مشرق و مغرب کے فلسفیانہ دبستانوں پر عبور کے باوجود بھی عدم

سلہ اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

نے جس طرح مولانا رومی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، انہیں پیر رومی کہا اور خود کو مرید ہندی ——— تو اس میں بھی ایک خاص شان کی کسر نفسی پائی جاتی ہے یہی نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی علامہ کا رویہ کچھ اس شعر کی مانند محسوس ہوتا ہے:

پڑھ لیے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

اس پر مرید ہندی کو پیر رومی جو جواب دیتا ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اقبال اور رومی کے فکری رابطہ کی اساس مہیا کرتا ہے:

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

علامہ کی یہ مشہور نظم "پیر و مرید" جہاں عصر حاضر اور اس کے انسان کے روحانی اور فکری مسائل کے بارے میں حکیمانہ نکات اور فکری بصیرت کے موتیوں کی ایک لڑی کی مانند ہے وہاں مرید ہندی اور پیر رومی کے مکالمات سے یہ نظم افلاطون کے مکالمات کی یاد دلاتی ہے جن میں سقراط قعر دانش کے بند در پے وا کرتا ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ فکر اقبال کا فکر انگیز خلاصہ ایک ایک دو دو اشعار کی صورت میں رومی کی زبان سے ادا کرا دیا گیا ہے چنانچہ علم حاضر، دور حاضر، یورپ جہاد، حسن مغرب، طالب علم، دین و وطن کی آویزش، سر آدم و غایت آدم، اسلام کی غایت، بیداری قلب، راز قیامت، خودی، بے خودی، استحکام ملت، دنیا سے تعلق اور دل سے تعلق، علم و حکمت، خلوت و جلوت اور اہل وطن کی تیرہ روزی۔ علم و حکمت کا کونسا ایسا نکتہ ہے اور فلسفۂ اقبال کا کون سا ایسا تصور ہے جس کے بارے

[illegible] رومی کی زبان سے نکتہ آفرینی نہ کرائی گئی ہو۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کسی ایک نظم میں فکرِ اقبال کی تمام توجیہات کے بارے میں اشارات کا مطالعہ کرنا ہو تو پیرِ رومی سے بہتر مثال پیش کرنی ممکن نہ ہوگی۔ پیرِ رومی نے رشد و ہدایت کے جس سلسلہ کا آغاز اس نظم میں کیا وہ جاوید نامہ میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچتا ہے۔ جاوید نامہ فکرِ اقبال کے ارتقائی مراحل میں ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہاں مولانا رومی سے فکری رابطہ رکھنے والی انتہائی حدود کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے پیرِ رومی میں رومی کی فکری معیت میں خلیفہ زیست اور مرگ حیات کی جس فلسفیانہ توجیہ کا آغاز کیا، جاوید نامہ میں وہ فلسفہ کی صورت میں وہ تکمیل پا جاتی ہے۔ پیرِ رومی نے جن مسائل پر یکے بعد دیگرے اشارہ کی صورت میں گفتگو شروع کی تھی جاوید نامہ میں ان کی تفصیل عالمی تصورات سے متعلق کی صورت میں ہمیں ملتی ہے۔ زبان کی یہی تاثیر جس وقت بالخصوص [illegible] میں ایک [illegible] اقبال کی [illegible] حیات کی [illegible] اقبال کی [illegible] ابتدا کی [illegible] حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

[illegible]	گفت مرگ قلب؟ گفتم نرگ [illegible]
[illegible]	گفت جہاں؟ گفتم کہ [illegible]
[illegible]	گفت عالم؟ گفتم خود [illegible]
[illegible]	گفت جنت چیست؟ گفتم [illegible]
[illegible]	گفت [illegible] گفتم کہ دید

از کلام لذت جانش فزود
نکتہ ہائے دلنشیں بر من کشود

واضح رہے کہ ان اشعار میں وہی نکات ہیں جن پر پیرایہ بند شعر و نثر میں گفتگو کی گئی ہے۔ جاوید نامہ میں علامہ نے جن شخصیات کے حوالے سے زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی وہ یہ ہیں:

گوتم، زرتشت، طاسلانی، جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا، مہدی سوڈانی، جنید، غالب، قرۃ العین طاہرہ، نطشے، سید علی ہمدانی، ملا طاہر غنی کاشمیری، شاہ ہمدان، بوعلی قلندر، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، ٹیپو سلطان ـــــ ان کے پہلو بہ پہلو وہ شخصیات بھی ملتی ہیں جن کی زندگی کے سبھی پہلوؤں سے اقبال نے پہلو اثبات حاصل کیا ہے مثلاً ابوجہل، فرعون اور ابلیس وغیرہ۔

فلسفۂ اقبال میں مختلف فکری نظریات کے بارے میں باعتبار [illegible] اور اقبال شناسوں نے اس ضمن میں تحقیق و مطالعہ کی کئی اہم و معروف تصنیفات کے باوجود گفتگو کی ہے لیکن جاوید نامہ کا کرداری نکتہ نظر سے جائزہ لینا [illegible] کہ اس میں جن شخصیات سے اقبال نے [illegible] سب کی سب متقی ہیں [illegible] کسی نہ کسی طور پر اپنے عصر کو [illegible] والے، دوسرے کے لیے بھی ایک خاص نوع کی علامت بن گئیں اس پر مستزاد ان کی زندگی اور فکر و نظریات میں ایسے تصورات کی موجودگی جو کسی نہ کسی طور پر اقبال کے لیے [illegible] گفتگو کی صلاحیت رکھتے تھے یوں دیکھیں تو جاوید نامہ کی یہ شخصیات [illegible] انداز زیست اور شعار حیات کی بنا پر نہ صرف یہ کہ اقبال کے لیے باعث کشش ثابت ہوتی ہیں بلکہ فکر اقبال کے تشکیلی عناصر کی تفہیم کے لیے بنیاد بھی مہیا کرتی ہیں۔

اپنے مختلف خصائص کے باوجود، بلکہ جاوید نامہ کی مانند اقبال کی شاعری میں ایک
مخصوص [illegible] رہنما نظر آتا ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں اسے خود ہی ظل فوقی قرار
دیا ہے۔ [illegible] سے اقبال نے مشرقی، مغربی کئی شخصیات سے کچھ نہ کچھ اثرات
[illegible] آپ کی سب جاوید نامہ میں موجود نہیں ہیں لیکن جاوید نامہ میں منعکس
شخصیات میں جو کلیدی حیثیت [illegible] اقبال نے جن [illegible] کی گرہ کشائی کرائی ہے اور
ان سب کا وہ [illegible] شعور سے مقابلی مطالعہ [illegible]
[illegible] کر سکتے ہیں۔

(۲)

[illegible] اقبال نے [illegible] اپنے گذشتہ رویوں کا جو ارتقائی مطالعہ کیا ہے [illegible]
[illegible] کہ اقبال کی [illegible] تو [illegible] وہاں تک [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] ۱۹۱۵ء [illegible] صدیوں پر ایک دور کا اختتام ہی نہ ہوا [illegible]
[illegible] ادبیات [illegible]
[illegible]

تحریک نرالی تھی، اس زمانے میں بھی اور ایک صدی گزر جانے کے بعد آج بھی ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو محض مسلمان نہ دیکھنا چاہتے تھے بلکہ انہیں محمڈن بنانا چاہتے تھے۔ انہیں بے دین، نیچری، ملحد، موقع پرست، انگریزوں کا ایجنٹ، جاہ پرست اور ذاتی نام و نمود کا طلب گار سب کچھ کہا گیا لیکن آج جبکہ نزاعات کی گرد بیٹھ چکی ہے اور شدید جذبات کے غیض و غضب کے طوفان ختم ہو چکے ہیں تو ان کی شخصیت پر نگاہ بازگشت ڈالنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلمان میں نہیں

سرسید کی تحریک کی بنیاد انگریزی اور اس کے حوالے سے مغرب سے فکری مقتدرہ کے اس تصور پر استوار تھی جو آج متروک ہے مگر اس زمانہ میں اپنے اپنے مخصوص نقطہ نظر کے موجب یہ ملحدانہ، باغیانہ اور ترقی پسندانہ محسوس ہوتا تھا۔ سرسید کی تحریک حالی کی تحریک تھی چنانچہ انہوں نے اپنے رفیقوں جیسے حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد کی امداد سے مذہب، تعلیم، ادب اور سماج میں اصلاح کی ایک لہر دوڑا دی۔ اس کے خلاف ردعمل بھی کم شدید نہ تھا چنانچہ گیرا آبادی کی طنزیہ شاعری اس ردعمل کی نمایاں ترین مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

سرسید پر کو بہت سے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ مسلم اکثریت سرسید اور ان کی تحریک ہی تھی جس نے برصغیر کے مسلمانوں پر انگریزی کے دروازے کھول کر انہیں مغرب سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقع دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات نے برصغیر میں جس متوسط طبقہ کو جنم دیا اس کی مخصوص ضروریات کی تکمیل اس سے بطریق احسن ہو جاتی تھی اس طبقہ نے بعد ازاں ادیب، سیاست دان اور معلم مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ حصول پاکستان کی جنگ کے لیے سپاہی بھی فراہم کئے۔

لیکن اپنی تمام تر توانائی سے خیالات اور اصلاح پسندی کے باوجود یہ تحریک بنیادی طور پر
حالی کی تخلیق تھی۔ ان کے تمام تصورات کی بنیاد صرف اس امر پر تھی کہ انگریزوں کی
حکومت اب ایک ناگزیر معاملہ ہے اور اسے اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے ہی میں
مسلمانوں کی فلاح ہے۔ اور اسی بنا پر سرسید، حالی اور آزاد وغیرہ نے اس کا پرچار
کیا۔ یوں کہنے کو یہ مقصد پسندی کی تحریک تھی لیکن یہ دوسری بات ہے کہ بعد کے حالات
نے اس مقصد پسندی کی بنیاد بننے تک اس مصرعے سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ

[illegible]

اس صدی کے آغاز میں سب قبال کا تخلیقی شعور نکھر رہا تھا اور ایک خوش فکر
شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت کا آغاز ہو چکا تھا تو بعض میں سرسید، حالی اور شبلی
کی تحریک کی نمائندہ خصوصیات بھی موجود تھیں اور اکبر الہ آبادی کی صورت
میں [illegible] اقبال نے مقصد پسند شاعر کے لیے قبست اور منفی کی صورت میں
[illegible] یا [illegible] پیدا نہ کیے۔ لیکن قبال نے [illegible]
[illegible] سے تعمیر [illegible] ہے تو اقبال کے اپنے ہی الفاظ میں
[illegible] خود اپنی روشنی کا خود طلب ہی ہے بلکہ
دوسروں کی راہ نمائی بھی کرتا ہے۔

[illegible] فکر [illegible] کہ [illegible] مقصد پسندی ایک نہایت اہم کی صورت میں موجود
[illegible] مقصد پسندی کی تحریک نے [illegible] ادب و فن میں، سماجی اہمیت دیتے ہوئے
[illegible] بلندی کے لیے [illegible] کام کیا۔ سرسید کے رد عمل میں اکبر الہ آبادی
[illegible] کی صورت میں [illegible] اور [illegible] کی مقصدیت کا اظہار کر رہے تھے

سرسید اور اکبر دونوں کو انگریزوں اور ان کے اثرات سے مثبت اور منفی کے باوجود بنیادی قسم کی دلچسپی تھی اس لیے دونوں کی مقصدیت ایک تصویر کے دو رخوں ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اس صدی کے آغاز تک یہ سب میلانات واضح صورت اختیار کر چکے تھے، اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سرسید، حالی اور اکبر سے خصوصی طور پر متاثر ہونے کے باوجود انگریزوں اور انگریزیت سے وابستہ اشیاء اور افکار و تصورات کو چنداں اہمیت نہ

سلہ ملاحظہ ہو نظم "سید کی لوح تربت"

سلہ حالی پر ایک جلسہ میں اقبال نے یہ رباعی فی البدیہہ کہی تھی،

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمور مے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا — جاری ہے مرے لب پہ کلام حالی

مزید ملاحظہ ہو یہ نظم "شبلی و حالی"

سلہ اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں یہ لکھا:

"میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی
مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی عقیدت و اہمیت
اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت
جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو
اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں

(اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ جلد دوم ص ۳۴)

دل چکرا اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ان سب کو بدعت تنقید بنایا اس مخالفت میں ان کا
نہ زاہد رہا نہ بادہ کی مانند نہ تو جذبات میں رنگا ہوا ملتا ہے اور نہ ہی انہوں نے لباس
و رشتا خود دو نوشش کی صورت میں محض سطحی صورتیں خود کو محدود رکھا۔ فلسفہ نے اقبال
کو نظاری توانائی بخشی تھی اس کی بنا پر ان میں وہ تحلیلی ذہن اور تجزیاتی صلاحیتیں
روح شیاء و تغیرات اور نسلہ رد صورت کے داخلی تضادات کو دیکھ سکتے تھے۔ یوں قوی
نے فکری رویوں کی صورت میں برصغیر میں مقصدیت کی دوسری مرتبے حد قوی لہ موجود
نظر آتی ہے اس ضمن میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سرسید کی مانند اقبال نے پنے فکر
کی بنیاد دے کر کوئی تحریک نہ شروع کی کیا ان کی توانائی اور فلسفہ زیست کے تجزیہ
کا یہ عالم ہے کہ اقبال پنے وجود میں خود ایک تحریک بنے جبکہ ایسی تحریک جس سے
فکر کی توانائی آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے، ان تصورات میں آج بھی رہنمائی کرنے
کی صلاحیت موجود ہے اور ان کے نظریات میں آج بھی مشعل راہ بننے کی جرأت ہے۔

(۴)

ورا کی سے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ آج اقبال کی تخلیقی زندگی
کی یوں صدی کے بعد ان کے انتقال کے ۴۰ برس بعد اور پاکستان کی تیس سالہ زندگی
کے بعد ہمارے فکری رویے علاوہ کے فکری رویوں سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں؟
ان کے کتنی روشنی حقیقت اور قومی زندگی کے شجر میں ان سے کس حد تک تازگی
پیدا ہوئی ہے۔

فکر اور اس سے جنم لینے والے مخصوص رویے یوں ہی خلا میں پیدا نہیں ہوتے
یہاں یہ بھی ہے کہ یادیں باتیں کی پیاری میں من پسند پھولوں کی مانند نہیں کھلایا جا سکتے

جا سکتا ہر چند کہ بقدر ہمت اوست سبھی ان پھولوں سے ذہنی ملک روم کی تزئین کی کوشش کرتے ہیں، جن کے اپنے آنگن میں پھول نہیں کھلتے وہ خرید کر لے آتے ہیں دوسروں سے مانگ لیتے ہیں اور یہ سب کچھ نہ ہو سکے تو درآمد کر لیتے ہیں چنانچہ ہمارے ہاں سچ پوچھئے تو پھولوں سے لے کر ادب، لٹریچر، تصورات و تخیلات سب کچھ وافر مقدار میں درآمد کیا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ غلامی کے اس شعر کی موجودگی میں کیا جا رہا ہے

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھکو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

مزدور کی مانند افراد اور پھر ان سے جنم لینے والے معاشرہ اور ان معاشروں سے تشکیل پانے والی قوم کا اپنا ایک مخصوص سلوب حیات ہوتا ہے جو بنیادی امور میں اجتماعی نفسیات سے رنگ اخذ کرتا ہے جس طرح اپنے مخصوص وراثتی میلانات، نسلی خصائص اور شخصیت کے انفرادی رجحانات کی بنا پر فرد میں مخصوص نوعیت کے نفسیاتی الجھاؤ جنم لیتے ہیں اسی طرح اپنے اجتماعی شعور میں ایک قوم بھی فرد ہی کی مانند مخصوص نفسی میلانات کی حامل نظر آتی ہے جب ہم پاکستانی، بھارتی، چینی یا امریکی کو بطور ایک علامت استعمال کرتے ہیں، ان کی اجتماعی ذہنیت سے چند نفسی میلانات کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں تعریف یا مذمت کرتے ہیں تو یہ دراصل اسی اجتماعی نفسیات کی بنا پر ہی ہوتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اپنی قوم کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر چند مخصوص نفسی میلانات کی اساس دریافت کرنی مشکل نہ ہوگی۔ جن میں غالباً نرگسیت کو سرفہرست قرار دیا جا سکتا ہے، اس نرگسیت نے ہم میں ایک خاص نوع کی جذباتیت پیدا کی ہے ایسی جذباتیت

جس کا مغربی سیاسی تعلقات کے انداز سے لے کر قومی سیاست کے اسلوب تک کئی جہات پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نزکیت کے اہم ترین مظاہر میں سے مذہب کے بارے میں ہمارے رویہ نے غیب پر تضاد صورت حال کو جنم دیا ہے ایک طرف ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام ہی برحق، عظیم اور آفاقی ہے لیکن دوسری طرف خدا کے ساتھ ہمارا تعلق بگڑے بچے ایسا ہے جو شرارت، بدتمیزی اور حکم عدولی کو اپنا جائز حق سمجھتا ہے اور اپنی شخصیت کے اظہار کا طریقہ بھی ہم چند کہ مسیحی عقیدہ کی مانند اسلام میں خدا باپ کے روپ میں نہیں دیکھا جاتا اور نہ ہی بائبل کی مانند قرآن مجید میں DEAD GOD ایسا ایک تصور موجود ہے۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ جب اسلام کی اپنے تحریکی بات ہو تو ہم حد درجہ پرجوش اور جوشیلے نغمہ خواں ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس صورت حالات میں ہم تند و تند ہو جاتے ہیں اور دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان اس کے تقاضے اور احساس کا الفراق ہمیں ملاکے وجود میں نظر آتا ہے اور پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جہاں طریقت بطور ایک اور وقار اور فعال ہے۔ کبھی کبھی اس معاملہ میں افغانستان بہت بڑھا ہوا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس وقت میدان ہمارے ہاتھ میں ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو ہم مسلمانوں کا اس کے بارے میں ہمیشہ جذباتی رویہ رہا ہے جس کی تسکین کے لیے قومی سطح پر کسی ایک شخصیت کو بطور ایک علامت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ بطور ایک CAPE GOAT چن کر اس کی دل کھول کر مذمت کی جاتی ہے۔ چنانچہ سرسید سے لے کر غلام احمد پرویز تک ایسی ہی شخصیات مل جاتی ہیں۔ اس نوع کی مذمت سے جو نفسی سرور حاصل ہوتی ہے جس طرح گناہ کا

وجود کا کیتھارسس ہوتا ہے اور "آلودہ" رہنے کے باوجود جس طرح اپنی تطہیر ہوتی ہے اس کی نفسیاتی اہمیت اتنی واضح ہے کہ اسے بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کے بارے میں جس رویہ کا اظہار کیا گیا اس کا نفسیاتی مطالعہ عبرت انگیز ہی نہیں بلکہ ہماری قوم کی تضادات سے پر نفسیات پر ایک نئی زاویے سے روشنی بھی ڈالتا ہے اقبال کی زندگی میں شکوہ ایسی نظموں، ہدایت کی نازیبا تصوف پر اعتراضات، اور حافظ کی نکتہ چینی کی بناء پر عام مسلمانوں نے بالعموم انہیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی نے تو مذہب کے نام پر اختلافات میں شائستگی کو ملحوظ رکھا مگر مولوی نے حسب عادت دین کو ہلاک ہتھیار بناتے ہوئے اقبال کی تکفیر پر تل گئے۔ اس کے برعکس ان دنوں اقبال کو صاحب کرامت ولی کا درجہ دیا جا رہا ہے اور ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے اقبال کی مخالفت میں مذہبی جنون کا اظہار کیا جاتا تھا مگر اب ان کے حوالے سے مبالغہ آمیز مذہبی جذباتیت کی تسکین کی جا رہی ہے۔

ہمارے فکری رویوں کی تشکیل اور جذباتی ساخت میں مذہب بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے اس لیے مذہب اور اس کے حوالے سے اقبال کے بارے میں جذباتی رویوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا۔ یہ مطالعہ مجمل اور صرف چند اشارات تک محدود ہے مگر اس سے وابستہ جزئیات میں کافی سے زیادہ تنوع ملتا ہے ایسی نازیبا تصویر جو درخت کی جڑوں کی مانند دور تک نیچے اترتی ہی چلی جاتی ہے۔

(۴)

یہ اقبال کے افکار کی گہرائی اور ان کی شاعری کی کشش تھی کہ نہ صرف

جلد ہی ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ کئی جلد ان کے افکار و تصورات کے مطالعات اور تشریحات میں ناقدین کی کئی نسلوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کی ہیں، اور اب فکرِ اقبال کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر ناقدین نے خامہ فرسائی نہ کی ہو لیکن اس کے باوجود بسا اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اپنے اقبال شناسوں کی بیشتر تحریریں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ فکرِ اقبال ایک طلسمی قلعہ ہے جس میں معانی کی سبز پری مقید ہے مگر اس قلعہ میں داخلہ کے لیے جس اسمِ اعظم کی ضرورت ہے شہزادہ اسے بھول چکا ہے اور اب وہ دھوپ کے منتر پڑھ کر اپنی خفت مٹا رہا ہے چنانچہ بند دروازوں کے پیچھے معانی کی سبز پری اپنے مقدر پہ نوحہ کناں ہے۔

کسی بھی قوم کے اجتماعی فکری رویوں کی عکاسی اس کی تخلیقات اور ان تخلیقات کی ترجمان تنقید سے ہوا کرتی ہے۔ اپنی تمام تر بوقلمونیوں کے باوجود ایک مخصوص عصر کی تخلیقی کاوشوں میں قوم کی سائیکی اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں جلوہ گر ہوا کرتی ہے۔ تخلیق وہ PERSONA ہے جس سے انسانی شخصیت اپنے لیے گوشۂ عافیت کا انتخاب کرتی ہے اور تنقید دولہا کا وہ دوست مشتاق ہے جو اس گوشۂ عافیت میں چھپی دلہن کے خدوخال کے حسن کی تحسین کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں تخلیق و تنقید قمر کے دو نسلوں کا تصور ملتا ہے، جو غلط ہے کہ نقاد کا کام تخلیق کار کو چاروں شانے چت کرنا نہیں اور نہ ہی وہ تخلیق کار کو اپنی برتری کے شاک کرانے کے پیمانے چاہتا ہے۔ تخلیق اور تنقید کا حال تو دولہا دلہن کا ہے جس طرح ہنگامِ وصل کسی کی فتح ہوتی اور نہ کسی کی شکست بالکل اسی طرح تخلیق اور تنقید میں بھی جب حسنِ معانی اس رابطہ کا ہے تو فرد ... دوستی ورنہ نالی کی نعمتیں عطا کرتا ہے۔ اس استعارہ کو جاری

رکھا جائے تو پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ فکرِ اقبال وہ دلہن ہے جو ابھی تک مشتاق ہاتھوں والے محبوب کے انتظار میں گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی ہے بے شمار دل والے آتے ہیں لیکن دلہن کے حسن کی تاب نہیں لا پاتے یوں عرضِ مدعا کے بغیر ہی بے نیل و مرام رخصت ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں، کیونکہ گھونگھٹ اٹھا نہ پائے، اصل خدوخال دیکھنے سے محروم رہے اس لئے نارسائی کی خفت مٹانے کو دلہن اور اس کے حسن کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں اور اس انداز میں گویا لذتِ وصل سے مزید وہی بہرہ یاب ہو سکے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلہن سونی سیج پر منتظر ہے، اب تک سیج کے پھول نہ مرجھائے تو یہ اس کے ... اپنے وجود کی آواز کی بنا پر ہے، اب تک اگر اس کے حسن میں مسحور کن کشش ہے تو یہ اس کی اپنی شخصیت کی داخلی توانائی کے باعث ہے

میں استعارہ میں دور تک نہ گیا لیکن فکرِ اقبال تک نارسائی کو ریاضیاتی انداز میں بھی بآسانی واضح کیا جا سکتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری سے جدید اردو تنقید کا آغاز کیا جاتا ہے یہ ۱۹۳ء میں طبع ہوئی تھی گویا اس صدی کے آغاز میں اردو تنقید اور اس کے حوالے سے جن مغربی کی ترجمانی کی جا سکتی ہے ان کی عمر کل سات برس بنتی تھی اس صدی کے آغاز سے اقبال کی شاعری کا نہ صرف باقاعدہ طور پر آغاز ہو چکا تھا بلکہ وہ ۱۹۰۰ء میں اپنی مشہور نظم نالۂ یتیم لکھ چکے تھے اگلے دس برسوں میں اقبال کا یہ شہرت حاصل کر چکے تھے ۱۹۱۵ء میں اسرارِ خودی طبع ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ لندن سے شائع کیا جس سے پہلی دفعہ اہلِ مغرب مشرق کے اس مفکر سے متعارف ہوئے چنانچہ اقبال کے اولین مجموعوں میں ہر رٹ ریڈ اور ای ایم فارسٹر ایسے معروف ناقدین نے اعتراف

ذکرِ اقبال بیس سال میں قومی سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئے ایسی حیثیت جس
میں آنے والے زمانے نے پختگی بھی پیدا کی اور اس میں مزید اضافہ بھی کیا۔ لیکن ۱۹۲۰ء
میں اردو تنقید کس مقام پر کھڑی تھی؟ ابھی وہ محض لفظی بحثوں عروضی مناقشوں اور
ایسے ہی دیگر ٹیکنیکل مسائل میں الجھی تھی اس کے پاس سائنٹیفک تصورات نہ تھے نہ
وہ تجزیہ و تحلیل سے آشنا تھی ایسی تنقید کی حد کمال محض محاسن گنوانے تک محدود ہوتی
ہے چنانچہ محاسن کلام غالب کی صورت میں اس تنقید نے نکتہ عروج حاصل کر لیا۔
یہ کتاب اس وقت چھپی جب مغرب کے دانشور اقبال کے نام سے واقف ہو چکے تھے
محسن نے آبادی زمین، منافع اور وسائل پیداوار میں تناسب کے لیے جو ریاضیاتی فارمولا
بنایا تھا اسے اگر فکر اقبال کے ارتقاء اور ارتقائی تنقید پر منطبق کریں تو دلچسپ نتیجہ برآمد
ہوتا ہے۔ اس صدی کے آغاز سے لے کر ۱۹۲۰ء تک فکر اقبال مسلسل رفتار پذیر تھا
ہاں البتہ اس کی رفتار بہت سست تھی چنانچہ یہ GEOMETRICAL
PROGRESSION کے فارمولے ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲ سے واضح کیا جا سکتا ہے
جبکہ ہمارے تنقید کا سفر MATHEMATICAL PROGRESS کے مطابق
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ کی رفتار سے جاری تھا اس لیے علامہ اقبال ایک شہسوار کی
رفتار سے فکر کے جس راستے سے گزرے تھے ہماری تنقید جس تک کروڑوں کم
انتالیس ہزار سال اس سے بہت پیچھے نظر آتی ہے۔

جب تخلیق سے براہ راست تعلق رکھنے والی تنقید کا یہ عالم ہے تو باقی امور کا موازنہ
کیا ہے۔ ہمارے ہاں مغرب سے کوئی حقیقی فلسفہ نہ پیدا ہو سکا جو ہمارے کوئی مجتہد پیدا کر
نہیں سکا اور جو علامہ اقبال مغرب سے کسی درجے میں کوئی معنی کا نقطہ ہو وہاں فکر اقبال سے

کسب فیض کیسے ممکن تھا۔ اس لیے اقبال نے اپنی زندگی میں جو بات کی تھی وہ آج اسکے پاکستان میں بھی اتنی ہی درست معلوم ہوتی ہے۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رگ گھونی و ملا کے غلام اے ساقی

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے!
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

ہم لوگ طبعاً روایت پرست ہیں کہ یہ انداز ہماری سست روی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے اس لیے ہم نئی لکیر بنانے کے مقابلہ میں لکیر پیٹنا زیادہ پسند کرتے ہیں علامہ اقبال کے ساتھ بھی یہاں یہی سلوک کیا گیا ہم نے حسب عادت انہیں بھی ایک روایت بنا بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک شاندار روایت میں تبدیل کر لیا ہے اور بس!

علامہ اقبال نے زندگی میں یہ کہا تھا:

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

معلوم ہوتا ہے خدا نے اقبال کی یہ دعا قبول کر لی ورنہ افکار کی نظر بندی کے لیے پاکستان سے بڑھ کر بہتر غار اور کہاں دستیاب ہو سکتے تھے؟

اقبال کے اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے چمکے جو نہ خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

ساتذہ کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم کی مانند علامہ اقبال کی اور بھی اسی مضامین ہیں جن میں علم، طالب علم اور معلم کے بارے میں اپنی ناخوش فہمی کا اظہار کیا گیا بلکہ اس نوع کی نظموں کا شرف نقادی سے تجزیہ کرنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ نے اساتذہ کو تو بطور خاص ہدف بنایا ہے حالانکہ اقبال ایسا خوش قسمت شاعر تھا جسے مولوی میر حسن، داغ اور پروفیسر آرنلڈ جیسے قابل اساتذہ ملے پھر اقبال اساتذہ سے کیوں ناخوش ہے کہیں اس لیے تو نہیں کہ انہیں علامہ کے اساتذہ میں کوئی میر حسن اور آرنلڈ نظر نہیں آتا۔ یہ سوال کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو۔ اس موقع پر اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اساتذہ کی اہمیت کے اس سوال کا جواب دینا ہے کہ ان نامور اساتذہ نے اقبال کی شخصیت پر

فہم و ذہانت اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے افکار و تصورات پر کس حد تک ژرف اندازی کی
ہے۔ مزید برآں اقبال نما نایاب اقبال شناسی اور ان کی اس ساتھ نے بھی کچھ سود مند کردار
ادا کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ کچھ کردار ادا کیا تو خاطر نوعیت یہ کہ ان کتنے دور تک سامنے
آ جاتی ہیں۔

حصول علم میں استاد جو کردار ادا کرتا ہے اس کی بھی بصورت خاص توضیح کی ضرورت نہ ہوتی چاہئے
لیکن کیا استاد شاگرد میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کر سکتا ہے؟ اس سے فلسفے کے شعبے وجود
کی نشوونما کر سکتا ہے، اور اس کے تخیل کو بلند پرواز کر سکتا ہے۔ [illegible]
[illegible] اس میں دنیا ممکن ہو [illegible] جو [illegible] کی
اس شاعر [illegible] "امر بخودی" اور "رموز بے خودی" کی تخلیق کر پائے کہ انہوں نے [illegible]
پیر حسن جیسے مانے ہوئے استاد سے پڑھی تھی۔ مولوی حسن نے تمام عمر فارسی کی تدریس
میں بسر کی [illegible] تھے [illegible] اقبال کو [illegible]
[illegible] فلسفہ کی تعلیم [illegible] کے فکری اساس [illegible]
[illegible] فلسفہ میں اقبال کو ہونہار شاگرد [illegible] فرد [illegible]
[illegible] کی [illegible] کوئی [illegible] نہیں تھی [illegible] ان [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] پڑھنے [illegible] قابل [illegible]
[illegible] استاد [illegible] کسی [illegible] موضوع کے بارے میں صرف معلومات [illegible]
[illegible] اس [illegible] کی مدد [illegible] سے روشناس کر سکتا ہے کتاب [illegible]
تو بنا سکتا ہے۔ صاحب کتاب نہیں۔

[illegible] میں یقیناً ان کے اساتذہ نے بھی کردار ادا کیا۔ البتہ جزوی

لیکن یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اقبال، اگر مولوی میر حسن سے فارسی نہ پڑھتے تو کسی نہ کسی طرح بھی پڑھ کر فارسی کے اتنے ہی بڑے شاعر ہو سکتے تھے جس طرح [illegible] کا فیض بھی [illegible] تک بنتا ہے کہ انہوں نے اقبال میں فلسفہ فہمی پیدا نہ کی اور یہ صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ کم از کم امتحان پاس کرنے کی حد تک۔

یہ تو تھا ان چیزوں کا ذکر جن کی تحصیل ممکن ہے جن کا نصاب ہوتے ہیں اور پاس یا فیل ہونے کی صورت میں نتائج کی جانچ کا ایک معیار بھی مقرر ہوتے ہیں لیکن شاعری جیسی تخلیقی چیز میں تو استاد کا کردار اتنا بھی نہیں بنتا۔ استاد شاگرد میں تخیل تصور اور خیال نہیں پیدا کر سکتا۔ محض زبان کی اصلاح کر سکتا ہے یا بحر عروض کی خامیوں کی نشان دہی۔

اقبال نے داغ کی شاگردی کی تو بحیثیت ایک مفکر کیا حاصل ہوا یہ شاعری بھی زانوئے تلمذ تہ کرنے کے برعکس بذریعہ ڈاک تھی۔ داغ جگت استاد تھے اور ہندوستان بھر سے آئی ہوئی غزلوں کی درستی کے لیے چھپا خاصا اصلاح فارم رکھتے تھے۔ اقبال کی غزلوں میں دیگر شاگردوں کے مقابلے میں زبان کی غلطیاں نسبتاً کم تھیں جس لیے داغ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دیا کہ مزید اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقبال کو اصلاح زبان کے علاوہ اور کیا دے سکتا تھا۔ میرے خیال میں اقبال کو اس سے صرف اتنا سا نفسیاتی فائدہ ہوا ہوگا کہ داغ جیسے استاد نے میرے کلام میں اب اصلاح کی گنجائش نہیں رکھی۔ چنانچہ بانگِ درا میں رنگِ داغ میں چند غزلیات کے علاوہ اقبال کی تمام شاعری داغ اور اس کی مخصوص دلچسپیوں سے کوسوں دور نظر آتی ہے۔ حالانکہ اقبال نے اپنے متروک کلام میں داغ کی شاگردی پر نازاں ہونے کے ساتھ امیر مینائی سے خصوصی طور پر متاثر ہونے کا

[illegible]

[illegible] نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگرد کی داغ سخنداں کا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہو چکے تھے چنانچہ نہ صرف یہ کہ اقبال نے نظموں میں نئی اور عملی مسائل کی طرف توجہ دی بلکہ غزل کو بھی برائے نام رہ گئی اور غزلیں کہیں تو بال جبریل میں شامل عمر نما غزلیں کہیں۔ ابتدائی دور کا کلام اور رنگ داغ کی تمام غزلیں متروک قرار دے دیں۔ اقبال نے داغ کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا، اگرچہ شاعرانہ اعتبار سے وہ بے حد زور دار ہے لیکن اس لحاظ سے بے حد مصنوعی ہے کہ اس مرثیے سے کوئی داغ سخن داں کا قطعی حساب نہیں ہوتا۔

یہ مرثیہ بے حد مصنوعی ہے کہ بانگ درا میں موجود سب وقت کے مرثیے میں سے یہ دو اہم اشعار حذف کر دیئے۔ ایسے اشعار جن میں اقبال نے داغ سے یہ کہا:

جوہر رنگیں زبانی پا چکا جس دم کمال
پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر
داغ یعنی وصل فکر میرزا و درد میر

اسے اقبال کے عدم خلوص پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ اس کی بیدلی کی وجہ یہ ہے کہ فکر کی سطح پر اقبال نے داغ سے کچھ نہ حاصل کیا، یہ شاعری چونکہ زبان و طرز تک ہی محدود تھی اس لیے بے حد سطحی ثابت ہوئی۔

اقبال نے بعض اساتذہ سے باقاعدہ تلمذ حاصل کیا اور ان کے تربیت خوشے نمایاں بھی ہیں۔ اس ضمن میں حالی، کبیر اور رومی کے نام لیے جا سکتے ہیں

۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں ماتوانی کی بنا پر حاضر نہ ہو کر اپنا کلام

نہ سنا سکتے تھے چنانچہ یہ عزت اقبال کے حصہ میں آئی۔ حالی کا کلام سنانے سے پیشتر اقبال نے یہ رباعی فی البدیہہ پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نام حالی
معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
جاری ہے میرے لب پہ کلام حالی

داغ کی شاگردی پر فخر کے بعد حالی سے یہ پرخلوص عقیدت خاصی تعجب خیز محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ سمجھنی اتنی مشکل نہیں جیسا کہ عرض کیا اقبال فکری سطح پر داغ سے کبھی بھی متاثر نہیں ہو سکے۔ لیکن حالی کی قومی شاعری، ملت کے لیے درد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کی اور سب سے بڑھ کر مدوجزر اسلام جیسی شاہکار نظم اقبال کے بے ثبات کے مطابق تھی۔ اقبال ملک و قوم کے لیے مبہم طور پر جو کچھ محسوس کرتے تھے وہ سب حالی کے کلام میں کسی نہ کسی طرح سے منعکس نظر آرہا تھا۔ یہ دونوں باتیں تھیں کہ مدرسہ بالخصوص یورپ سے واپسی کے بعد جب اقبال نے خودی کی صورت میں اپنے نظریہ و تصورات کی اساس استوار کرنی تھی وہ حالی، بلکہ پوری سرسید تحریک کی انگریز پرستی کے خلاف مجسم ردعمل بن گئے۔

حالی نے ۱۹۰۵ء کے بعد سے موسے حادثات میں نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں میں بھی قومی و ملی موضوعات کے اظہار کا آغاز کیا گو ان کے ہمعصرین اور شاگرد امیر کے حادثات کے رسیا قارئین کی اکثریت نے حالی کی روکھی پھیکی غزل کو پسند نہ کیا لیکن اردو شاعری میں حالی نے قومی شاعری کی جس روایت کا آغاز کیا اس سے

اقبال کی صورت میں نقطۂ عروج پایا، چنانچہ نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں کی صورت میں بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ داغ سے چل کر حالی کی غزل تک پہنچنا اور پھر اسے بھی ایک سنگ میل قرار دے کر سفر جاری رکھنا، یہ فکر اقبال کے اہم ترین مدارج میں سے ہے۔ ناقدین نے اس پہلو کی طرف بطور خاص توجہ نہ دی۔ اقبال نے حالی کی وفات پر "شبلی و حالی" کے عنوان سے جو نظم لکھی، اس میں حالی کے ضمن میں یہ اشعار قابل توجہ ہیں:

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوان جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرود رفتہ کے نغمے علوم نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
پتھر ہے اس کے واسطے موج نسیم بھی
نازک بہت ہے آئینۂ آبروئے مرد
مردانِ کار ڈھونڈ کے اسباب حادثات
کرتے ہیں چارۂ ستم چرخ لاجورد
پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ رازدار
کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد

اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال کے تعلقات میں جو خلوص اور محبت ملتی ہے وہ شروع سے نہ تھی کیونکہ تصوف کے ضمن میں خواجہ حسن نظامی اور اقبال میں جو بحث چلی اکبر اس میں خواجہ حسن نظامی کے ہمنوا تھے، چنانچہ اکبر نے اس ضمن میں اقبال کو ہدف طنز بھی بنایا لیکن اس بحث کی گرد دب جانے کے بعد دونوں میں جو رشتۂ اخلاص استوار ہوا اس میں پھر کسی طرح کی کمی نہ ہو سکی۔ اکبر کا رویہ

اقبال کے بارے میں قدرت ALLAH BAKHSH سا ہے لیکن اقبال اکبر کے غیر مشروط مداح تھے

اس کے ساتھ ساتھ یہ دو خطوط بھی ملاحظہ ہوں کہ ان سے صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ

اقبال اکبر کو کس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

"میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید پیر

کو دیکھے۔ اور دل میں عقیدت و اہمیت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے

وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو

چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔"[1]

تنقیدی نکتہ نظر سے مندرجہ ذیل خط بے حد اہم ہے۔

"ہم لوگ شاعر نہیں ہوتے بے خود ہوتے ہیں ان کو باضابطہ کسی شاعر

کو دیدیتے وہ شاعر ہو تو اس کو خود دینا مقصود ہو اس کے نام ان کو لکھئے۔

باضابطہ دیکر اس کا تمغہ سے اس کی فوقیت کا تمغہ ہے اس سے اس کے

خیال سے چند شعر آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر وہ کے بجائے وہ

بدلنے سے اس کا مفہوم کچھ اور ہو جاتا ہے اور میرے اس عمل سے طبیعت

غریب تاثر پیدا کرتی ہے۔"[2]

مندرجہ بالا خط سے یہ واضح ہے کہ اقبال نے اکبر کو شاعر کی حیثیت

کے تمغے کا اعتراف کیا ہو چنانچہ بانگ درا کے آخر میں ضمیمہ کے عنوان تلے

رنگ میں اس عہد کے سماجی، سیاسی، تعلیمی اور اخلاقی مسائل پر جو منظومات تعلیمی تلقین ہیں

---

[1] "اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ (جلد دوم) ص: ۲۴

[2] ایضاً، ص: ۴۱

اسلوب کے ساتھ ساتھ خیالات پر بھی اکبر الہ آبادی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کبر ہی کی مانند اقبال نے بھی شیخ، واعظ اور مُلّا کو محض الفاظ سے بڑھ کر بطور علامات استعمال کیا چند اشعار پیش ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدِ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند
غیرت نہ تجھ میں ہو گی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
رندِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

یہ اور اس نوع کے دیگر اشعار پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال نے لکھے ہیں تو نہیں بلکہ اکبر کے اشعار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اکبر اور اقبال میں ایک قدرِ مشترک یہ تھی کہ دونوں مغربی تہذیب کے مخالف تھے اور اسے بلا جھجک یہ بات بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص مضر سمجھتے تھے۔ طنز و ظرافت سے اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ اقبال نے مغرب سے اپنا یہ ہتھیار روشن خیالی علم اور فلسفہ سے لیا۔ اقبال تمام عمر مذہب کے دامن سے وابستہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کی نگاہ مغربی تہذیب کے سطحی پہلوؤں تک محدود رہی۔ وہ اس تخیلی نگاہ سے عاری تھے جو اشیاء اور واقعات کے داخلی تضادات، جارحیت اور تشدد سے ہے۔ اکبر مغربی تہذیب کو ہدفِ تنقید بنانے میں لباس، خورد و نوش اور انجمن سازی سے آگے نہ جا سکا جبکہ فلسفے اور جدید علوم کے مطالعہ کے بعد اقبال نے فکری سطح پر مغربی تہذیب کے داخلی تضادات کو جا کر کرتے ہوئے اس کی خودکشی کی پیش گوئی کی۔ اقبال کی رائے میں اکبر الہ آبادی بہت بڑے شاعر تھے اور اپنے مخصوص رنگِ سخن میں وہ واحد شاعر تھے جن کی عام اردو شعراء کی مانند ان کی فکری سطح برائے نام تھی۔ اس لئے اقبال جیسے مفکر کا ان سے مستقل اثرات قبول کرتے رہنا ناممکن تھا۔ فکرِ اقبال کے تناظر میں اکبر الہ آبادی کو ایک سے زیادہ ایک "SPRING BOARD" قرار دیا جا سکتا ہے نئی بلندیوں کی طرف

جست لگانے کے لئے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کے مترادف مطالعہ اقبال میں مولانا رومی کے تذکرہ کا یہ عالم ہے کہ گویا دبستان کھل گیا!

مطربے غزلے بیتے از مرشد روم آور

تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

چو رومی در حرم دادم اذاں من

ازاد آموختم اسرارِ جاں من

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او!

بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

رومی آں عشق و محبت را دلیل

نشۂ کامال را کلامش سلسبیل

اقبال نے لاتعداد اشعار و نظموں میں مولانا رومی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنا مرشد قرار دیا جبکہ جاوید نامہ میں رومی کی زبان سے زندگی کے ظاہری و باطنی پہلوؤں پر حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا۔ اس ضمن میں اقبال کا رویہ افلاطون سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس نے مکالمات کا مرکز اپنے استاد سقراط کو بنایا۔ اقبال کی نظم پیر و مرید اس انداز کی خوبصورت مثال ہے۔

مرید ہندی:۔ چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں

علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی :-

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مرید ہندی :-

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر رومی :-

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

مرید ہندی :-

اے نگاہ تیری میرے دل کی کشاد
کھول مجھ پر نکتۂ حکمِ جہاد

پیر رومی :-

نقش حق را ہم بہ امر حق بشکنی
بر زجاج دوست سنگ دوست زن

اس انداز پر یہ ڈرامائی مکالمہ جاری رہتا ہے۔ اس طویل نظم میں اقبال کا مرید واقعی شاگرد نہیں۔ اقبال نے خود کو مرید ہندی کہا اور رومی کو مرشد۔ یہ تو محض علامتی بات نہیں بلکہ واقعی اقبال نے رومی سے بہت کچھ حاصل کیا۔

مولوی میر حسن نے کہا تھا کہ رومی کا اقبال نے علم و فن کی حد تک ہی

ہفت خوان طے کئے۔ اقبال بآسانی سر استاد کے دام میں آنے والا شاہین ..... نہ تھا۔ وہ فکر کی جن بلندیوں تک جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی بنا پر قال روایتی معنوں میں عام اساتذہ سے کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔ انہیں تو مشد روم کی ضرورت تھی اور وہ بالآخر اس تک رسائی حاصل کرتے ہیں یہی نہیں بلکہ اس استاد تک پہنچکر انہیں پھر کسی استاد کی حاجت محسوس نہیں ہوئی۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
شرح او کردند و او را کس ندید
معنیٔ او چون غزال از ما رمید
رقص تن از حرف او آموختند
چشم را از رقص جاں بر دوختند
رقص تن در گردش آورد خاک را
رقص جاں بر ہم زند افلاک را
علم و حکم از رقص جاں آید بدست
ہم زمیں ہم آسماں آید بدست

علامہ اقبالؔ اور نیرنگِ خیال

——اقبالؔ شناسی کا ایک دور——

اس صدی کے آغاز میں لاہور سے شیخ عبدالقادر نے "مخزن" کا اجرا کیا۔ تو اب اسے جریدی صحافت میں ایک اہم موڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل اگرچہ لاہور اور بعض دیگر شہروں سے ادبی جریدوں کی اشاعت کے سلسلہ کا آغاز ہو چکا تھا مگر سنجیدہ قارئین کے لیے "مخزن" ایسے سنجیدہ فکر جریدہ کے روپ میں شیخ عبدالقادر نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی وہ لاہور میں یوں پھلی پھولی کہ لاہور ہمیشہ کے لیے ادبی جرائد اور ان کے حوالے سے ادبی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ آج پون صدی کے بعد بھی ادب اور ادبی جرائد کے سلسلے میں برصغیر اب بھی لاہور کی طرف دیکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ لاہور کے اہم ادبی پرچوں کے حوالے سے اردو ادب کی گزشتہ پون صدی کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

مخزن، نیرنگ خیال، ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، سویرا، نقوش اور فنون یہ محض چند جریدوں کے نام نہیں بلکہ مختلف ادبی میلانات کے دھاروں کے تال میل کی داستان کے درخشندہ ابواب ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس صدی کے آغاز سے اہلِ پنجاب

میں تھے اور اجرائے اہل قلم کی تخلیقی کاوشوں کی تشہیر میں بھی ان جریدوں نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ دبستان لاہور کی اصطلاح استعمال کرنی ہو یا پنجاب میں اردو ناول کا ارتقا ہو تو تخلیقی مصنفین کے ساتھ ساتھ ادبی جرائد کے فعال کردار کو کسی طرح سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ اس صدی کے آغاز سے علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کی نشوونما اور شہرت کے ساتھ ساتھ پنجاب کی جریدوں نے حمایت بھی بھرپور انداز سے کرنی کی۔ واضح رہے کہ بانگ درا کی پہلی نظم ہمارا مخزن کے شمارہ اول (اپریل ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔ جس طرح یہ نظم اردو کی شعری روایات سے ہٹ کر منفرد نظر آتی ہے۔ بالکل اسی طرح لاہور کے سنجیدہ ادب کے دائرے میں یہ جریدہ بھی برصغیر کے دیگر جرائد سے جداگانہ اور ممتاز نظر آتے ہیں اور ان منفرد اور ممتاز نظر آنے والے جرائد میں نیرنگ خیال کی ایک اپنی جداگانہ تاریخ ہے۔

حکیم یوسف حسن نے ۱۹۲۴ء میں لاہور سے اس کا اجرا کیا تو پہلے شمارے سے ہی اس نے اہل ذوق کا دامن دل کھینچ لیا۔ اب تک ادبی جریدوں کے کتاب کی طرف بطور خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن نیرنگ خیال نے کتابت و طباعت کا اعلیٰ ترین معیار قائم کرتے ہوئے بلند پایہ نگارشات کی حسن و خوبی کے ساتھ پیشکش کی طرح ڈالی۔ آج اپنی زندگی کے پچاس برس بعد نیرنگ خیال اُجڑا اُجڑا سا نظر آتا ہے اور نہ ہی اس کھنڈر سے گزشتہ حسن اور رعنائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن تاریخ ادب میں نیرنگ خیال کا کردار محفوظ ہو چکا ہے۔ نیرنگ خیال کے مدیر نے اور کچھ نہیں کیا ہوتا تو صرف ۱۹۳۲ء میں اقبال نمبر کی اشاعت ہی ایک ایسا

نامہ ہے کہ اس کی بناء پر نیرنگ خیال اقبالیات میں سرفہرست آجاتا ہے اور یہ اعزاز بذاتِ خود بہت اہم ہے۔ اس خصوصی اشاعت کے اداریہ میں حکیم صاحب نے یوں لکھا:

"ہندوستان میں اقبال کو جاننے والوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہوگی لیکن اقبال کو سمجھنے والوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ نہ ہو گی اور یہ حال دنیا کے ہر بڑے شاعر کا ہوتا ہے۔ لیکن اقبال نمبر کی اشاعت کے بعد توقع ہے کہ ہندوستان کا تمام تعلیم یافتہ طبقہ جوان مضامین کو غور و فکر سے پڑھے گا۔ اقبال کے پیغام کو سمجھنے لگے گا تو ان میں اس امر کی تحریک پیدا ہوگی کہ وہ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق زبورِ عجم اور جاوید نامہ کو سبقاً سبقاً پڑھیں۔

اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ نیرنگ خیال نے علامہ کی زندگی میں جس فنکارانہ انداز سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ وہ اقبالیات میں ایک گرانقدر مقام کا حامل ہے۔

محمد طفیل نے محمد نقوش بننے تک جن پُرپیچ مراحل کو طے کیا ان کے تذکرہ کا یہ محل نہیں لیکن اتنا ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں نقوش نے اردو ادب کو جو کچھ عطا کیا اس کا تذکرہ آج سے زیادہ کل کا ہوگا۔ یہ بھی محمد طفیل کی جدت پسندی ہے یا خراجِ تحسین کہ نیرنگ خیال کے اقبال نمبر (۱۹۳۲ء) کو نقوش کے لفافے میں لپیٹ کر یوں پیش کیا کہ اسے قران السعدین کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

اقبال پر سینکڑوں رسالے اور ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ مگر یہ نمبر ہزاروں ہی میں ممتاز سینکڑوں ہی پر بھاری ہے ——، اور یہ بھی کہ جب تک اقبال زندہ ہے۔ اس پر کام کرنے والے زندہ ہیں۔ یہ نمبر بھی زندہ

ہے حکیم صاحب بھی زندہ!

یہ نیک خیال کا چرچا تو سب نے سنا تھا لیکن دیکھا بہت کم تھا۔ چند محققین یا اقبال شناسوں کے کتاب خانوں میں محفوظ چند پرچے جنہیں شے مسروقہ کی مانند سب سے چھپا چھپا کر رکھا جاتا تھا محمد طفیل کا اقبال شناسوں پر یہ واقعی احسان ہے کہ انہوں نے قبال نمبر کی خوشبو کو عام کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

موت سب کچھ چھین لیتی ہے مگر وہ کسی سے اس کے

کارنامے نہیں چھینتی!

یہ بالکل درست ہے اور نیرنگ خیال، اقبال، نقوش اور محمد طفیل کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے۔

(۲)

اس صدی کے آغاز سے علامہ کی شاعری پر شہرت کا جو آغاز ہوا تو دونوں وقت کے پرچے اڑتی سیں ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی شائع ہوئی جس نے حافظ اور تصوف پر اعتراضات کی بنا پر ایک طرف علامہ کو تنگ نظر مسلمانوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا تو دوسری طرف ۱۹۲۰ء میں نکلسن کے انگریزی ترجمے نے مغربی دانشوروں کو علامہ کے فکر و فن سے متعارف کرا دیا۔ چنانچہ اقبال کے اولین مجموعوں میں ای ایم فارسٹر پروفیسر ڈکنسن اور ... کے نام بے حد معروف ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے گویا اسرار خودی کے بعد سے علامہ کے سامنے نیا ادبی ادب اسلوب اور شاعرانہ مسلک متعین ہو گیا کیونکہ اس کے بعد تخلیق کی جانے والی منظومات ان کے مخصوص پیغام کی ترسیل ہی نہیں کرتیں بلکہ قدم قدم اسے نکھارتی ہیں۔

آئندہ میں برسوں میں علامہ کے فکر و فن کی متنوع جہات اور ان سے وابستہ جزئیات میں نکھار آتا گیا اور رقصِ افکار مستحکم اور پائندہ تر ہوتا گیا۔ اگرچہ علامہ کی مخالفت، تکفیر کی صورت میں نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ لیکن کہنہ تعصبات کے اندھیرے میں بھٹکنے والے چند مذہبی شدت پسندوں سے قطع نظر عوام کی اکثریت میں ان کی شاعرانہ عظمت، مقبولیت اور محبت کا اثر گہرا سے گہرا تر ہوتا گیا چنانچہ زندگی ہی میں ان کی فکری عظمت کا اعتراف کر لیا گیا۔ عوام کی سطح پر بھی اور خواص کی حد تک بھی۔ اسی لیے ان کی زندگی ہی میں ان پر لکھنے کا آغاز ہو گیا تھا۔

یہ مرحلہ بذاتِ خود بہت اہم ہے، اس لئے کہ اردو تنقید کی عمر کوئی ایسی خاص زیادہ نہیں ہے اگر مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۲ء) سے اردو تنقید کی عمر گنی جائے تو اس صدی کے آغاز تک وہ صرف سات برس کی تھی۔ یوں سمجھیے کہ تنقید اور اقبال دونوں نے تقریباً ساتھ ساتھ اپنا تخلیقی سفر شروع کیا مگر ہوا یہ کہ اسرارِ خودی تک اقبال کا فکر جوانی کی پختگی حاصل کر چکا تھا مگر تنقید بائیس برس کی عمر کے باوجود ابھی تک ناپختہ تھی۔ اور بالعموم اندازِ کی حامل۔ اس لیے اس وقت تک اردو تنقید، لفظی اور عروضی بحثوں کے چکر میں پھنسی نظر آتی تھی اور اس کا سب سے بڑا سرمایہ محض تشریحی اور توضیحی مضامین تھے۔

اردو تنقید کی فلسفہ، نفسیات اور دیگر اہم اور جدید علوم سے برائے نام آشنائی تھی اس لئے چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر عام اردو تنقید حالی کے "مقدمہ" آزاد کی "آبِ حیات" اور شبلی کی "شعر العجم" سے آگے نہ دیکھ سکتی تھی۔ بالفاظِ دیگر اردو تنقید ابھی تک ایک ہی دائرہ میں گردش کناں تھی جبکہ فکرِ اقبال مسلسل ارتقا پذیر تھا اور مستقل عمودی سفر میں۔ تجزیہ و تحلیل سے عاری اردو تنقید میں درحقیقت اقبال شناسی کی سکت نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ ناقدین نے مقالات قلم بند کئے بلکہ علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے

بعض مقامات تو ان کے سخت تنقیدی معیار پر پورا اترنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ہمیں ابتدائی دور کے ناقدین کی تنقیدی کاوشوں کی اہمیت کو کھٹانا نہیں چاہتا۔ ہمارا مقصد ان کی طرف توجہ مبذول کرانی مقصود ہے کہ ایسا تو اقبال پر لکھنا ہے اس وقت اس کے بس کا روگ نہیں، اور دوسرے اقبال پر لکھی جانے والی بیشتر تحریروں میں سا وقات سوچ کی کمزوری، خیالات کی تکرار اور انداز نظر میں تنوع کے فقدان کا احساس ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری وہ بہت دور تک جاتی ہے۔

یہ سب وہ تنقیدی نقاط ہیں جن اقبالیات کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں اور [illegible] یہ بہت سال اقبال [illegible] ہیں جو ہمیں [illegible] ہیں۔ [illegible] اقبال شناسی میں [illegible] کی پیش رو [illegible] جن میں بہت تاریخی اہمیت کے لحاظ سے بھی اور تنقیدی قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی [illegible] ممتاز حسن، صوفی تبسم، ڈاکٹر نکلسن، [illegible] قادری اور سید نذیر نیازی [illegible] ایسے ہیں جنہوں نے اقبالیات میں بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔

اقبال پر لکھا گیا [illegible] کے باوجود یہ [illegible] تک زندہ رہا اور [illegible] کے لیے خوراک کی چیز بنا رہا [illegible] کے مندرجات پر ایک [illegible] جاتی ہے۔

(۳)

[illegible]

اجاگر ہوگی بلکہ ان کے تنوع کے حوالے سے فکرِ اقبال کی مختلف جہات بھی نمایاں ہوں گی۔

سوانح

۱۔ ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال — از منشی محمد دین فوق

۲۔ علامہ اقبال کے استاذ — از شیخ آفتاب احمد

تصورات کی تشریح

۳۔ اقبال اور سیاسیاتِ عالیہ — از سید نذیر نیازی

۴۔ متفاد اقبال — از غلام احمد پرویز

۵۔ علامہ اقبال ایک پیغامبر کی حیثیت میں — از عبدالرشید فاضل

۶۔ علامہ اقبال — از احمد علی خان درانی

۷۔ اقبال ایک مصلح کی حیثیت سے — از شیخ عبدالرحمٰن

شاعری کا مطالعہ

۸۔ اقبال کی شاعری — از ملک راج آنند

۹۔ پیامِ اقبال — از قاضی عبدالغفار

۱۰۔ اقبال کی شاعری پر قیامِ یورپ کا اثر — از ممتاز حسن بی اے

۱۱۔ علامہ اقبال کی شاعری — از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

۱۲۔ کلامِ اقبال کی ادبی خوبیاں — از محمد اکبر خان

تجزیۂ کتب

۱۳۔ تشریحات اقبال — از عبدالرحمٰن بجنوری

۱۴۔ جاوید نامہ — از محمد سلیم اختر چوہدری

۱۵۔ جاوید نامہ — از چوہدری محمد حسین

۱۶۔ پیامِ مشرق — از ڈاکٹر نکلسن

۱۷۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ — از سید نذیر نیازی

فلسفۂ اقبال

۱۸۔ فلسفۂ سخت کوشی — از چراغ حسن حسرت

۱۹۔ علامہ اقبال اور فلسفۂ تصوف — از ادیب سہیل آبادی

۲۰۔ اقبال اور فلسفۂ مغرب — از ممتاز حسن

تقابلی مطالعات

۲۱۔ اقبال اور اسلامی دنیا کے دیگر شعرا — از ملک عبد ستیوم

۲۲۔ ٹیگور اور اقبال — از مرزا عسکری علی خان

۲۳۔ میرزا غالب، اقبال — از حامد حسن قادری

۲۴۔ شاعرانِ عالم و شاعرِ مشرق — از حفیظ قریشی دہلوی

متفرقات

۲۵۔ اقبال اکاڈمی — از راغب احسن ایم اے

۲۶۔ اقبال پر ایک محققانہ نظر اور اس کی نفسیاتی تشریح — از راغب احسن ایم اے

۲۷۔ حسن عقیدت — از محمد عمر نور الٰہی

نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر کے اولین مقالہ (اقبال اکاڈمی) کا سرطاس، زندگی کی ISLAMIC FAITH (لندن ۱۹۲۸ء) میں مطبوعہ ایک تحریر کے اقتباس سے آغاز کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریر اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ استاد محترم نے اپنے نامور شاگرد کے فکر و فن اور تخلیقی شخصیت پر جو تبصرہ کیا، وہ اختصار کے باوجود بے حد جامع ہے کہ ان کے بقول:

> مشرق اور ہندوستان میں حرکت تجدید نے اپنا ممتاز ترین ظہور سر محمد اقبال کی شاعری میں حاصل کیا ہے۔ جو مشرقی اور مغربی فلسفہ و زندگی کے یک متین و عمیق محقق ہیں وہ تازہ سے تازہ فلسفیانہ تفکر کے ترقیات سے آگاہ ہیں اور انہوں نے برگسن اور نیٹشے کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ لیکن سر محمد اقبال اپنے زبردست علم و فضل اور وسیع مطالعہ و تحقیق کے باوجود ہرگز دوسروں کے خیالات کی آوازِ بازگشت نہیں ہیں بلکہ امتیازی طور پر ایک اصلی (اور یکتا) مفکر و مجتہد ہیں.....
>
> اس رائے کی روشنی میں "نیرنگِ خیال" کے مقالات کا مطالعہ کرنے پر یہ محسوس

ہوتا ہے کہ یہ اس رائے پر ایک علمی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں ایسی دلیل جس کی ترتیب میں نے دے رہے ہیں کے ناقدین ادب نے بالعموم اور اقبال شناسوں نے بالخصوص اپنے تعصب کے جوہر دکھائے۔

مرزا خودی کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت پر بعض انگریز دانشوروں نے اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ان میں سے مسٹر ریڈ اور ایک ایرانی فارسی کے مقابلہ تو خصوصی تھے۔ بالخصوص مسٹر ریڈ نے ایک مضمون بعنوان 'VEIWAGE' ۲۵ اگست ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ مسٹر ریڈ نامقالہ کون کہہ سکتا ہے کہ ہر سے بڑھ کر ہے کے انداز پر تھا۔[1]

بیان پروفیسر ڈکنسن نے دق تجسس میں ماہنامہ زمانہ دہلی کا اظہار کرتے ہوئے فلسفہ اقبال پر شدید اعتراضات کرتے ہوئے نہیں خوبیں شمار کر دیا تھا۔ اقبال نے اس کے جواب میں مترجم ڈکنسن کو جو خط لکھا اسے فلسفہ سخت کوشی کا عنوان دے کر بطور مضمون شامل کیا گیا ہے۔ مترجم جناب حسن سرت بعد میں اقبال نے ۲۰۰۰۴۵ء میں شیخ عطاء اللہ میں بھی اسے بطور ایک مکتوب شامل کیا گیا۔ فلسفہ تبا

---

[1] مسٹر ریڈ نے بہترین شاعری کے لیے مابعد طبیعیات کا معیار مقرر کرتے ہوئے کہا تصور کے معیار پر گرتا ہے کے پیش نظر کی پیروی کرتے ہوئے ایک ایسا ... آتا ہے جو کہ عیار ثابت ہوگا۔ اور یہ بھی ثابت کر دے کہ وہ ہمارے عقیدہ و دنیا کا شاعر ہے۔

میری مراد محمد اقبال سے ہے۔ آج جبکہ ہمارے مقامی شاعر اپنے بے تکلف حباب کے ... کیٹس کے تتبع میں کیٹس کی طرح ایسے ہی گھریلو موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں ... ایک ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے ... جوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔"

سخت کوشی اور سعی و عمل کی تلقین ملتی ہے علامہ پر کئے گئے اعتراضات کے جواب کے لیے یہ مضمون گو اب ایک بنیادی حوالہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ انسان کامل کے تصور کی تشکیل میں اقبال نے نہ صرف اپنے تصور کی اساس پر روشنی ڈالی بلکہ نیٹشے کے اثرات کی نفی کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں یہ لکھا:

"اس نے غلط بحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں[1]

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین کی اکثریت کی نظر سے علامہ کا یہ مکتوب نامقالہ نہیں گزرا۔ کیونکہ بیشتر مقالہ نگاروں کے لیے نیٹشے کا نام لینا فرض بن چکا ہے۔ حالانکہ نقوش کے اس نمبر کی بدولت اب نیٹشے نیٹشے کی گردان بند ہو جانی چاہیے۔

غلام احمد پرویز اپنے لبرل مذہبی عقائد اور تجدد پسندی کی بنا پر بیشتر مسلمانوں کے نزدیک ناقابل مشکوک ہیں۔ چنانچہ ان کی متنازعہ حیثیت کو مدنظر رکھ کر مقالے کا مطالعہ کیا تو ایک ناظر نے اسے پروفیسر ڈکنسن کے اعتراضات کا جواب دیا۔ علامہ کے مکتوب کی تفسیر پایا۔ پرویز نے برصغیر میں تصوف کے نام پر پھیلی مردہ دلی کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے

---

[1] علامہ اقبال کے اس مقالہ کا عنوان یہ ہے۔

THE DOCTRINE OF ABSOLUTE UNITY AS EXPRESSED BY ABDULKARIM AL JILI (مطبوعہ انڈین اینٹی کیوری بمبئی ستمبر ۱۹۰۰ء)

اردو شاعری میں یاس و قنوطیت کی روایت کے پس منظر میں علامہ کے پیغام حرکت و عمل اور جہد و سعی کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھا کہ اس سب کا نام تہذیب و اخلاق کے چراغ تھا۔ اس تناظر میں علامہ کے اردو اور فارسی کلام میں سعی و عمل کی ترغیب کے فلسفہ و مقاصد اجاگر کرتے ہوئے لکھا:

حقیقت سے آگاہی کا لازمی نتیجہ تھا کہ قوم کو اپنی بے حسی اور جمود و سکوت کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ جب دیکھا کہ قلب ملت میں زندہ حیات کی بیداری کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں، عرق [illegible] نمایاں ہونے لگے ہیں تو تخلیق [illegible] یا کم از کم تجدید [illegible] کی ضرورت [illegible] کیونکہ ایک طرف متاع حیات کی قدر و قیمت [illegible] دوسری طرف اپنی قوت بازو [illegible] احساس پیدا ہو گیا تو جب شفقت اور رفق [illegible] کے بیت [illegible] کا پیدا [illegible] اس کا لازمی نتیجہ تھا لہٰذا [illegible] کی تربیت [illegible] میں کہوں گا کہ یہی چیز علامہ صاحب کا حقیقی پیغام ہے۔ پہلی منزل [illegible] تجھنا چاہیے، اور قوت عمل کو اس کا نتیجہ۔ یہی جوہر تھا جس کے فقدان سے قوم پر مردہ حالی اور بے حسی کی گھٹا میں چھا رہی تھیں اور اس کی تعلیمی یا رجعت اس مرض کا علاج تھا:

"علامہ اقبال ایک ریفارمر کی حیثیت میں (از محمد عبدالرشید فاضل)، اور اقبال ایک مصلح کی حیثیت سے (از شیخ عبدالرحمٰن)، ایک ہی موضوع پر دو الگ الگ مقالات ہیں لیکن جب ان کے عنوانات میں یکسانیت ملتی ہے۔ اسی طرح دونوں کے انداز نظر اور استدلال میں یکسانیت نہیں۔ ان دونوں حضرات نے اقبال کو روحانی معنوں میں مصلح نہیں رہنما [illegible]

ان کے فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس اصلاح پسندی کو فلسفیانہ افکار اور پیغام حیات کے ساتھ مشروط کر کے قوم کے لیے لائحہ عمل دیکھا گیا ہے۔ بعض امور جیسے خودی کے بارے میں ان دونوں کے ہاں اشتراکِ فکر بھی ملتا ہے۔ سو ان کا تقابلی مطالعہ خاصا دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے۔

سید زبیر ہزاروی نے اپنے مقالہ اقبال اور سیاسیات عالمیہ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

"اقبال کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی افکار میں بت شکن واقع ہوا ہے۔"

اور دیکھا جائے تو یہ مفصل مقالہ اقبال کی اسی بت شکنی کی تشریح بن جاتا ہے۔ صاحب مقالہ نے یک ایک رکے مغربی سیاست کے اہم ترین نظریات کا جائزہ پیش کر کے اقبال کے سیاسی افکار کی روشنی میں ان کے حسن و قبح کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چنانچہ جمہوریت، قومیت، بین الاقوامیت اور اشتراکیت سب کا اقبال کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے نقائص اجاگر کیے گئے ہیں۔ مضمون کا اختتام علامہ کے جن اشعار پر کیا گیا ہے، وہ بھی بہت معنی خیز ہیں۔

انقلابی کہ نگنجد بضمیر افلاک — جنیہ و بیتے نہ بینم کہ چساں می بینم

نرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند — جوہر خنجر زلرزیدن تارے بیند

علامہ اقبال کی شاعری اور شاعرانہ منصب کی تشریح و توضیح میں جو پانچ مقالات قلم بند کیے گئے ہیں، ان کے اعتبار سے تو اہم ہیں کہ ان کے لکھنے والوں میں ملک راج آنند، قاضی عبدالغفار، ممتاز حسن اور صوفی تبسم جیسے اسماء نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اس بنا پر آج بھی کارآمد ہیں کہ اقبال کی شاعری کے ضمن میں بعض اساسی اہمیت کے نکات پر روشنی ڈالی

کلی ہے

اگرچہ ۱۹۰۵ء میں یورپ جانے سے پیشتر ہی اقبال کی شاعری عظمت سے مستلزم ہو چکی تھی، لیکن تین سالہ قیام یورپ نے اس میں ایک نیا اور نرالا تجربہ عطا کیا۔ یہ تجربہ جو مختلف امور میں ان کے لیے تعلیمی اہمیت بھی ثابت ہوا، یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ شاعر ذہانت کے باوجود اقبال بننے کے عمل سے گزر رہے تھے جب تک ان کے فکری مقاصد متعین نہ ہوئے تھے۔ لہٰذا قیام یورپ کا موضوع اقبال کی تخلیقی شخصیت کی نشوونما میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ممتاز حسن نے اقبال کی شاعری پر قیام یورپ کا اثر میں اقبال کی شاعرانہ شخصیت پر اس عہد کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جو نتائج مرتب کیے ان کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا:

قیام وطنیت کے دوران میں اقبال کی اردو شاعری میں ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کی نفسی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے بانگ درا کے حصہ دوم کی نظمیں ایک غیر معمولی دلچسپی رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں اقبال کے شاعرانہ ماضی کی یادوں اور اس کے شاعرانہ مستقبل کا پیش خیمہ ہیں ..... اگر ان نظموں پر ایک نظر نگاہ ڈالی جائے تو ان میں ذیل کی خصوصیات نظر آتی ہیں:

۱۔ زندگی کا شدید احساس جو ایک حد تک بیقراری تک جا پہنچتا ہے۔ حسن اور خصوصاً نسوانی حسن سے وابستگی جو عشق کے مترادف ہے۔

۲۔ جذبات کی غیر معمولی نزاکت اور محبت کا لطیف مضمون ایسے جذباتی موضوعات جو حساس نوجوانوں سے مخصوص ہے۔

۳۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کی ترجمانی یعنی اقبال کے دل و دماغ

سے بتدریج اس خیال کا ظہور کہ زندگی کوشش پیہم کا نام ہے۔ اقبال کی "پیغمبری" کا آغاز!

ملک راج آنند نے رائل اکیڈمی جرنل میں انگریزی میں جو مقالہ قلم بند کیا "اقبال کی شاعری" کے عنوان سے، وہی اس نمبر میں شامل ہے۔ ملک راج آنند نے اس مقالہ میں اقبال کی شاعری کے تمام ارتقائی مدارج کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے بھی یورپ میں اقبال کے دوران قیام کے اثرات سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں نہایت معنی خیز بات کہی ہے۔

اقبال کی بعض نظموں مثلاً کلی، سلیمٰی، تنہائی اور دریائے نیکر کے کنارے ایک شام سے معلوم ہوتا ہے کہ زمان و مکان کی زنجیریں کٹ گئی ہیں۔ عشق مجازی کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور وہ عشق حقیقی کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ لیکن جب جوانی کے عشق کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ عشق الٰہی کی چنگاری اس خاکستر سے سلگ اٹھتی ہے تو یورپ کی فضا انہیں راس نہیں آتی۔ ان کی وہ نظم جس میں انہوں نے مغربی اقوام کو مادہ پرستی اور تعیش کے خطرات سے متنبہ کیا ہے۔ اسی جذبۂ بے اختیار کا نتیجہ ہے ؎

"زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا"

یورپ میں قیام کے اثرات کی وضاحت کے سلسلہ میں یہ دونوں مقالات ایک ہی سلسلہ کی کڑی بن جاتے ہیں۔ ہر چند کہ ملک راج آنند کے مقالے میں اور بھی بہت کچھ ہے۔

جیسے کے خطوط کے شہرت یافتہ قاضی عبدالغفار کا مقالہ "پیام مشرق" ان کے مخصوص جذباتی اسلوب کی ایک بڑی خوبصورت مثال ہے۔ گو دیگر مقالات کی مانند اس کا بھی دلچسپی ہی ہے لیکن قاضی صاحب کی دلکش نثر نے اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے چنانچہ

شاعر زیر بحث میں جنہوں نے شدت کی خشکی کو محو دیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

اقبال کے سینے میں دو دلوں کا ٹھکانہ تھا۔ ایک شاعر کی حسن پرست اور عشق پرور روح اور ایک مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح۔ آخری دور میں حسن پرست روح ساکن اور مسلمان روح کے طبع ہنگامہ ہو گئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے علامہ اقبال پر جو کچھ لکھا ان میں علامہ اقبال کی تدریجی ارتقا صرف فہرست آتا ہے۔ شاید اس سے یہ مقالہ متعدد مرتبہ شائع کیا گیا۔ صوفی تبسم نے اس مقالے میں علامہ کی شاعری کے تین پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

الف : اقبال کا پیغام اور اس کی نوعیت!

ب : اقبال کا کلام یا فن شاعری۔

ج : اقبال کی شاعری کی حیثیت اور اس کا اثر!

صوفی تبسم نے علامہ کی شاعری اور اس کے فنی پہلوؤں کے تجزیہ میں وقت نظر کا ثبوت دیتے ہوئے اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے اور [illegible] کے اشعار کے حوالے سے ان کی شاعری کے مجموعی تاثر اور پیغام کی جہتوں کو نمایاں کرتے ہوئے جس رائے کا اظہار کیا وہ آج تقریباً نصف صدی بعد بھی درست تسلیم کی جائے گی۔

حضرت اقبال کی معجز نگاریوں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے [illegible] نسلیں ان کے الہامی نغموں سے اقتباس حیات کرتی رہیں گی۔

محمد یعقوب خان نے کلام اقبال کی ادبی خوبیاں میں علامہ کے کلام میں حسن [illegible] کو حسن الفاظ کی جدت سے روشن ہوتے دکھایا ہے۔ علامہ کی زندگی میں ان کی [illegible]

بیان پر اعتراضات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اپنی سطحیت کی بنا پر جلد ہی قابل وقعت اور درخورِ اعتنا نہ رہا کہ اہلِ نظر نے ان کے کلام کے جمالیاتی محاسن کی شناخت کر لی۔ یہ مقالہ اسی نداز نظر کی ابتدائی مثالوں میں سے ایک ہے۔ گو ناقدین کی کثرت نے بطور خاص علامہ کی زبان کے جمالیاتی اوصاف اجاگر کرنے میں تندہی کا ثبوت نہ دیا کہ اصل اہمیت ان کے فلسفہ، تصورات اور ان سے وابستہ جزئیات کی تھی لیکن پھر بھی یہ اور اس نوعیت کے دیگر مقالات قابل توجہ ہیں کہ ان سے اقبال کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ صاحب مقالہ کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔

"اقبال نے بہت کم نظمیں ایسی لکھی ہیں کہ جن کی زبان روزمرہ اردو کے عین مطابق، بہت زیادہ فارسی تراکیب سے پاک اور عام زبان کے لیے سریع الفہم ہو۔ لیکن جب وہ سہل نگاری پر اترتا ہے تو سلاستِ بیان اور روانیٔ جذبات میں اس کا نظیر ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

اقبال کی شاعری پر ان پانچ مقالات سے وہ جو کچھ تاثر مرتب ہو جاتا ہے جس کی روشنی میں علامہ اقبال کی شاعری اور اس سے وابستہ ہم مباحث کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے ان مقالات کے تناظر میں جب اقبال کی بعض معروف تصانیف کے انفرادی مطالعہ پر مشتمل مقالات کا مطالعہ کیا جائے تو فکر اقبال کی بیشتر جہتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔

سند۔ عابد علی عابد نے اپنی کتاب شعر اقبال میں اقبال کی زبان اور اسلوب سے خصوصی بحث کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا:

"جن صنائع لفظی و معنوی کا ذکر بلاغت کی کتابوں میں کیا گیا ہے وہ تمام کی تمام اقبال کے کلام میں موجود ہیں۔"

ڈاکٹر بجنوری اس صدی کی دوسری دہائی میں دہلی کے قدر دان ناقد تھے۔ مشرقی زبانوں کے کلاسیکی روایات سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ مغربی زبانوں اور ان کے فلسفہ و ادب سے بھی آگاہ تھے۔ ان کے قلم سے فنکار کا پیکر ان کے مشہور مقالہ "محاسن کلام غالب" میں آگیا ہے جس کا پہلا حصہ تو اب ادب مثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے اس مقالہ پر یہ مقام نکتہ بیان میں قلم بند کیا ہے کہ ہم نے اردو کا ادب، سب، اور بے شبہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر یہ چند بہترین مضامین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں بھی بجنوری کی علمیت اور مشرق و مغرب کے مطالعے کا خوبصورت امتزاج جھلکتا ہے۔ چنانچہ جب وہ فکر اقبال کے بعض پہلوؤں کی توضیح میں نیٹشے، بیرگسان کا نام لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ پڑھ کر اور سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔ بجنوری نے محاسن کلام غالب میں مغربی دانشوروں کے حوالے سے عظمت غالب کو ثابت کرنے کا جو انداز اپنایا تھا، اس مقالہ میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے فکر و فن کے خدوخال اجاگر کرنے کے لیے ان مغربی دانشوروں سے تقابل کیا گیا ہے۔ رومی، والٹر، ویٹمن، فوجیوں، فیثاغورس، سقراط، ہیگل، میکیاولی، دانتے، نیٹشے وغیرہ۔

ڈاکٹر بجنوری نے تصنیفوں کے حوالے سے اقبال کے بارے میں جو کہا اس کی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔

"اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آیا ہے اور خود ہی بیان موجود ہے اس کی شخصیت اس کی دونوں تصنیفوں سے سرِ خودی و رموزِ بیخودی پوری طرح

— اس مقالہ کا شیخ محمد اکرم نے اقبال کی تصنیفوں کے عنوان سے ایک دلنشین جو ہمایوں نومبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔

نمایاں ہے۔ ان میں وہ زندگی ہے، وہ طاقت ہے۔ جس کے لئے ہماری نئی نسل پرستے غزل گو شعرا کے دواوین کو بے سود کھنگالتی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر باک نہیں کہ اقبال ہمارے درمیان مسیحا بن کر آیا ہے۔ جس نے مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے ہیں۔ مثنویاں ایک ایسے غیر فانی کلام کا جزو ہیں جو تمکین کے بعد اسلامی دنیا کے خواب کی صحیح تعبیر ہوگا۔

اس مقالہ کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کرم ہرٹ ریڈ نے بجبوری سے استفادہ کرتے ہوئے خود کشیدہ الفاظ کو اپنے مقالے میں بتور جزو شامل کیا ہے (مطبوعہ "NEWAGE" ۲۵ اگست ۱۹۲۰ء)

ڈاکٹر نکلسن نے "اسرار خودی" کے انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو مغرب سے متعارف کرانے کے بعد اقبال کے فکر و فن پر مزید کام بھی جاری رکھا۔ اس ضمن میں ان کا مقالہ IQBAL'S MESSAGE OF THE EAST بہت مشہور ہے یہ ISLAMICA (لیپزگ ۱۹۲۵ء) میں طبع ہوا تھا۔ نیرنگ خیال میں "پیام مشرق" کے عنوان سے مولوی محمد عبداللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ مقالہ اقبال کی پیام مشرق کا ایک تجزیاتی مطالعہ ہے مگر اس اعتراف کے ساتھ کہ پیام کے کثیر حصہ کا سمجھنا مشکل ہے۔ نکلسن نے پیام مشرق کے، ہم پہلوؤں کا بہ طریق احسن محاکمہ کیا ہے، اور گوئٹے اور اقبال کے تصورات کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر نکلسن نے اس مقالہ کی ابتدا میں اقبال کو جن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا، وہ ایک پرجوش پاکستانی کی یاد دلاتے ہیں۔

"عہد حاضر کے ہندی شعرا میں اقبال ایک نہایت رفیع پایہ مقام رکھتا ہے۔ اس کے سازسے دو قسم کے نغموں کی صدائیں نکلتی ہیں۔ پہلی

صد ہندی الاصل ہیں جو ہندی حرمت وطن کے جذبات سے سے
دو طلب ہیں۔ اگرچہ زبان سیاسی حیثیت سے وطن پرست نہیں ہوتی
مگر دو خاک پر ان کا ہیرا ہے وہ مصلی زبان ہیں ہے جو سامان جمعیت کے
ساتھ مخصوص ہے درحقیقت یہ جذبہ وہ فیضان ہے جو پتی تحریر ہوں
سے اتنی شعلے اور خاکستر دور دور پھیلا ہوتے عنقریب ایک ہمائی قوت
کی حیثیت پیدا کرنے والے ہے

نصف صدی کے بعد ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ خواب کل کے ہیں۔

جاوید نامہ پر محمد سلیم چوہدری اور چودھری محمد حسین کے مضامین
ان میں سے قبل ازیں متعدد مرتبہ ذکر کئے جا چکے ہیں خاص محنت سے لکھے گئے ہیں
نگاروں نے علامہ کی اس اہم کتاب کا تنقیدی مطالعہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ چودھری
محمد حسین کے علامہ سے قریبی دوستانہ مراسم تھے۔ ان کا مضمون اس امر سے متعلق ہے
کہ علامہ کی تمام کتابیں ان کی کے زیر اہتمام چھپی ہیں۔ اس لیے یہ بات علامہ
کا کہ علامہ کی تصنیف مسلسل لکھنے کی وجہ سے انہوں نے ان کی تاخیر اور تعطل کے
بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ جاوید نامہ میں انہوں نے اپنے تجزیہ میں اس کا ذکر
دیا ہے اور اس ضمن میں مشرق و مغرب کے اہل قلم کے جو نام درج کیے ہیں ان
میں یقیناً کسی اور کا بھی فیضان نظر شامل ہوگا۔ میری اس بات سے اختلاف ممکن ہے کہ
نے اس مقالہ کو اسی نقطہ نظر سے بہت پڑھا اور شوق سے لکھا۔

انجمن اسلامیہ مدراس کی دعوت پر ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال نے

کے عنوان سے خطبات دیئے تھے جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوئے اور سید نذیر نیازی نے ان خطبات کا "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے نام سے ترجمہ شائع کر چکے ہیں۔ اس عنوان کا یہ مقالہ خطبات کے تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو فکر کی بناء پر علامہ کی شاعری کا مطالعہ بھی آسان نہیں لیکن خطبات میں خالص فلسفہ تھا۔ اگر اس کی تفہیم دشوار ہو گئی۔ اس لئے علامہ کے شعار پر داد دینے والوں کی کثرت نے خطبات کے بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا ہے۔ خطبات علامہ کی مفکرانہ شخصیت کے دور پختگی کی یادگار ہیں اور علم کی سوچ کا ثمر ہیں۔ چنانچہ سید نذیر نیازی:

> خطبات زیر نظر کا موضوع الٰہیات اسلامیہ ہے لیکن اس کی تشکیل نو میں علامہ ممدوح نے اس امر کو فراموش نہیں کیا کہ جدید یک متحرک تمدن اسلامی کا جو وسیع اور ہمہ گیر تخیل قائم کیا جائے اس میں اس کے مختلف اجزا کے تاریخی تشکیل و نما کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

شاعری کی لذت سے عاری اور فلسفہ کی خشکی سے بھاری ان خطبات پر ناقدین نے تو بہت لکھا جتنا کہ ان پر لکھنے کی ضرورت ہے۔ سو سید نذیر نیازی کا یہ مضمون ابتدائی و تعارفی ہونے کے باوجود اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

نیز اسلوب خیال کے تقریباً تمام قابل ذکر مقالات کا اجمالی ذکر کر دیا گیا ہے۔ ب صدر رغب احسن کا مقالہ رہتا ہے۔ اقبال پر یک محققانہ نظر اور اس کی نفسیاتی تشریح۔ اس مقالے کا عنوان چونکا دیتا ہے اور عنوان کی مانند مقالہ بھی اقبال پر لکھے گئے دیگر مقالات سے الگ ہے۔ کو عنوان کے بموجب اس میں اقبال کا کسی طرح سے بھی نفسیاتی

مطالعہ نہیں کیا یا لکھنے والے، جس کا یہ گمان ہے کہ انہوں نے ان تمام علمی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی عوامل کا جائزہ لیا ہے جو کسی نہ کسی طرح سے اقبال کی تخلیقی شخصیت کی تشکیل میں ممد ثابت ہو سکتے تھے چنانچہ جو ان مصنف۔

اقبال مادر گیتی کا وہ فرزند رشید ہے جس کی ذات میں ہمہ جہت شخصیت، سائنسی، یونانیت، رومانیت، اور ملائیت کی کیفیتیں ہم آغوش ہیں۔ وہ ارتقائے کائنات و ارتقائے انسانی کے مختلف تہذیبی مراحل کی معرفت سے آگاہ اور ان کا بانی تھا۔ ہمارے ہاں ایسے ادیب محض۔ [illegible] اور کچھ محض [illegible] پورے [illegible] ان [illegible] معرفی [illegible] وجہ [illegible] سامنے [illegible] کہ کسی نہ کسی [illegible] اقبال کی تخلیقی شخصیت [illegible] بقا کے ضامن ہیں جنہوں نے فکر اقبال کو ایک سانچے میں ڈھالا [illegible] اپنے عصر کا آئینہ بناتے ہوئے مستقبل ناجی بنا دیا۔

اب تک ان مقالات کا تعارف پیش کیا گیا وہ سب [illegible] کے کسی نہ کسی پہلو پر [illegible] کیونکہ [illegible] اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ [illegible] اقبال [illegible] کے مطالعہ [illegible] مہیا کریں گے۔

(۴)

[illegible]

ورق ورق دیکھا، وہ مضامین جو مجھے فائلوں میں ادھر ادھر بکھرے نظر آئے۔ انہیں بھی اس نمبر کی زینت بنا ڈالا۔ اس اضافے میں بڑے مضمون نگار بھی نظر آئیں گے اور بڑے مضمون بھی: ——— یوں محمد طفیل مطمئن ہو گیا۔ ٹنٹا ختم ہو گیا:

یہ الفاظ ہیں محمد طفیل کے، دراصل نہ طفیل مطمئن ہوتا ہے، اور نہ ٹنٹا ختم ہوتا ہے بلکہ کسی نہ کسی روپ میں جاری رہتا ہے۔ یہ ٹنٹے ہی کی بات ہے کہ جب طفیل نے مجھ سے نیک خیال پر مضمون لکھنے کے لیے کہا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان مضامین پر تفصیلی بات چیت کرنا جو کہ ۲۲، ۲۳ دسمبر اقبال نمبر میں موجود ہیں۔ مطلب یہ کہ جو مضامین انہوں نے خود اس نمبر میں شامل کیے ہیں۔ ان پر بات چیت مناسب ہے کیونکہ ان کا مدعا یہ ہے کہ حکیم صاحب ہی کے نامے کو زیادہ سے زیادہ جلا کیا جائے۔ تعلق خاطر کی ایسی مثالیں شاذ ملیں گی۔

ویسے اس حصے میں بھی کئی اہم مضمون شامل ہیں مثلاً سر پیر محمد اقبال کا ایک مضمون ہے جو مولانا حسین احمد مدنی کی کانگریسی سوچ کے تضادات جاری کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اسی طرح مولوی عبدالحق، خلیفہ عبدالحکیم، پطرس بخاری، دیانت حسین نجم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر سید عابد حسین، ایکزنڈر برسانی اور ڈاکٹر تاثیر کے مضامین ہیں۔ جو مجھے تفصیلی گفتگو پر آمادہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ وعدے کے مطابق نہیں ہو سکتا۔

پھر بھی ایک بات کہہ دوں کہ ڈاکٹر تاثیر کی نثر تاثیر (مرتبہ فیض احمد فیض مطبوعہ اردو اکاڈمی بہاولپور) میں بھی وہ مضامین شامل نہیں ہیں جو کہ اس حصے میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے یہ اور ایسے کئی مقالات دریافت کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۵)

یہ اقبال کی تاریخی شخصیت کا اعجاز ہے کہ بیس صدی سے قرنِ دوازدہم تک کے پرفکرِ اقبال کی تشریحات کی جا رہی ہیں لیکن بیسویں صدی سے قرنِ دوازدہم تک فکرِ اقبال کی تشریح و توضیح کی جو روایت ملتی ہے۔ وہ تباہیات میں جدید ترین کی طالب ہے حکیم یوسف حسن نے جس روایت کی بنا رکھی بظاہر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہونا چاہیے کہ طفیل کو بھی تو آخر کسی طفیل کی ضرورت ہوگی۔

عظمتِ اقبال کا معترف — ہربرٹ ریڈ

"اگر آج کے اپنے شعرا کی پرکھ کی جائے تو مجھے صرف ایک ہی ایسا زندہ شاعر نظر آتا ہے جو کم عیار نہ ثابت ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدے اور نسل کا شاعر بھی نہیں ہے۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے جس کی مثنوی "اسرارِ خودی" کا حال ہی میں فارسی سے ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے ترجمہ کیا ہے اور جسے میسرز میکملن نے طبع کیا ہے۔ آج جبکہ ہمارے مقامی مشاعر، اپنے بے تکلف حلقے میں بیٹھے کیٹس کے تتبع میں کتنے ہی دراز ہی کھردرے موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں لاہور میں ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔

(ہربرٹ ریڈ: ۱۹۲۱ء)

اسے علامہ اقبال کی فکر کا اعجاز سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ان کے فلسفہ کی اساس قرآن مجید پر استوار تھی مگر اس کے باوجود مغرب میں علامہ اقبال کے مداحین کی کمی نہیں۔ وہ مغرب جہاں کے دانشوروں کی اکثریت مذہب اور بالخصوص اسلام سے الرجک ہے مغرب میں فکرِ اقبال کی مقبولیت کا باعث ان کا پیغام سعی و عمل بھی ہے اور انسانیت کی عظیم اقدار کی اہمیت کا از سرِ نو احساس کرنا اس کی وجہ مشرق کی مخصوص مابعد الطبیعات کی پراسرار کشش بھی ہو سکتی ہے حتیٰ کہ مغرب کے نظامِ دانش و حکمت کے تضادات اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مخصوص طرزِ زیست اور نظامِ معیشت پر شدید تنقید بھی۔ الغرض! فکرِ اقبال کے اتھاہ سمندر میں متنوع وجوہات کے لہر در لہر سلسلے ملتے ہیں

لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ یہ بحث سے لے کر سیکولر مغرب تک علامہ اقبال کے مترجمین کی تعداد میں کمی کیا، وقت گزرنے اور علم و عمل کے نئے نئے زاویوں کی تشکیل کے ساتھ ان مترجمین کی تعداد فہرست میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

علامہ اقبال و مغرب سے متعلق گفتگو کرنے کا سہرا ڈاکٹر نکلسن کے سر جاتا ہے جس نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۰ء میں بیش قیمت مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے فوری ردعمل میں دو مضامین لکھے گئے ایک پروفیسر ڈکنسن کا اور دوسرا مشہور ناقد ای۔ ایم فارسٹر کا۔ ان دونوں مضامین کے اردو میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ان کے جواب میں محمد علی نے نکلسن کو ایک دانا دشمن جانا۔ جو اس کی طاقت کا قائل مگر دشمن قرار دیتا ہے کہ اس نے اسلام کی صداقت کے ساتھ ساتھ نطشے سے متاثر ہونے کی تردید کی۔ یہ تمام تحریریں [illegible] چکی ہیں اور ہمارے اقبال شناسوں نے ان پر خامہ فرسائی بھی کی ہے۔ البتہ ان میں سب سے اہم مضمون کا جس سے ہمارے تمام اقبال شناس واقف ہیں وہ مضمون "WRITER [illegible]" ہے جو اگست ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا۔ یہ مضمون بھی اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کے فوراً بعد لکھا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اہمیت یہ ڈکنسن و فارسٹر کے مضامین سے اس بنا پر کہیں بڑھ جاتی ہے کہ ڈکنسن کا مضمون معاندانہ ہے اور سلام کے بارے میں مغرب کے مخصوص تعصب کا مظہر ہے۔ فارسٹر نے البتہ ہمدردانہ رویہ اپنایا ہے۔

اس نے تو علامہ کو بیسویں صدی کا نبی قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بحث چھیڑنے والا ہے کہ نطشے میں علامہ کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کی بنا پر اس کا یہ مضمون [illegible] کا حامل قرار پاتا ہے۔

ہوا یہ کہ علامہ اقبال پر کام کرتے ہوئے مجھے ایک جگہ ہربرٹ ریڈ کی تحریر کا حوالہ ملا۔ تو یہ مضمون پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ کیونکہ جہاں تک یہ ہی معلومات کا تعلق ہے تو ہربرٹ ریڈ کا متذکرہ مضمون کبھی بھی نظر نہ گزرا تھا۔ جب تلاش بسیار کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ ملا تو ماہر اقبال شناسوں سے رجوع کیا مگر سب لاعلم نکلے۔ بالآخر میں نے دہلی کے کانگریس (اور تنگش) کو خط لکھ کر اپنی مشکل حال کرتے ہوئے مضمون کی نقل کی استدعا کی، وہ کیونکہ پاکستانی لائبریری نہ تھی اس لیے انہوں نے مضمون کی نقل ارسال کر دی۔ اور یوں اس اہم ترین مضمون کا پہلی مرتبہ ترجمہ پیش کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہو گئی۔

ہمارے ہاں اب تک علامہ اقبال پر مختلف پہلوؤں سے کئے گئے تحقیقی کام کے سلسلہ میں ہربرٹ ڈکنسن اور ڈارسٹ کا نام آتا تھا لیکن ہربرٹ ریڈ بھی ان میں شامل ہو جاتا ہے اور جہاں تک ہربرٹ ریڈ کی دنیائے نقد و شعر سے تعلق ہے تو ہم شہزادہ دونوں سے کہیں زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔

جب ہم ہربرٹ ریڈ (1893-1968ء) کو نقاد کہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محض ادب تک محدود رہا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہربرٹ ریڈ کو بنیادی طور پر انسانی شخصیت کی تخلیقی فعالیت سے دلچسپی تھی اسی لئے انسانی ذہن کی ان تمام کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ کیا جو تخلیق کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ شاعری سے لے کر مصوری اور مجسمہ سازی تک اس نے ہر فن کی تخلیقات کے تجزیہ و تحلیل کے ذریعے سے انسانی ذہن کی تخلیقی فعالیت واضح کر دی۔ ویسے اس کے لیے یہ کام مشکل بھی نہ تھا کیونکہ وہ خود شاعر بھی تھا اور اس کی تنقیدی کاوشوں نے اس کی شاعری کو دبا دیا حالانکہ اس کی شاعری بے حد اہم ہے اور قابل مطالعہ ہے۔ اس کے شعری مجموعے:

1- COLLECTED POEMS 1913-25 (1926)

2- "POEMS" (1935) 3- "POETRY" (1953)

ہربرٹ ریڈ کی بیشتر تنقیدی کاوشوں کی اساس نفسیات پر استوار نظر آتی ہے لیکن ان نفسیاتی نقادوں میں سے نہ تھا جو نفسیات سے سنسنی خیزی اور چونکانے کا کام لیتے ہیں وہ متوازن مزاج اور معتدل اسلوب

کا عمل تھا کہ جب ابتدا میں اس نے فطرت، خصوصاً [illegible] دیہی کا حسن [illegible] کیا [illegible] کے ساتھ ساتھ وہ ٹرونک کے دور میں آیا جب اس حد تک کہ اب [illegible] ناقدین میں ایک مقام حاصل ہے۔[1]

نفسیاتی تنقید کی اساس ہر بڑے فن پارے کی تخلیق کے پیچھے تخلیق کار کی شخصیت [illegible] ہے۔ تخلیق کار کے لاشعور کو سمجھنے کی کوشش کی گئی درحقیقت یہی تخلیقی [illegible] تخلیقی [illegible] توانائی کا منبع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تخلیق کی نفسیاتی [illegible] اہمیت [illegible] کی تخلیق سے کر ایک طرف تخلیق کار نفسی [illegible] کیفیات [illegible] تو دوسری طرف [illegible] سے حسن مندی کی ایک [illegible] جاتی ہے۔ [illegible] کے مثبت [illegible] پر ایک [illegible]

مصوری کی تاریخ کے مطالعے سے اور [illegible] کے دوسرے نقشوں میں مصوری [illegible] دستہ کاری کا [illegible] ہیں تو [illegible] ہیں ہم [illegible] بہتر ہے [illegible] کی دنیا سے ہم [illegible] پیدا کرنے کے لیے [illegible] ایک ایسا [illegible] ہوتی ہے جسے انسانی سائیکی [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] یہ ہے کہ مصوری کے [illegible] کسی [illegible] مصوری کی تکنیک سے [illegible] حشر کو [illegible] کر کے [illegible] حساسات میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کیا جاتا ہے [illegible] قوت [illegible] دوسرے [illegible] یہ جمالی حساسات [illegible] پیدا کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] تکنیکی [illegible] دیرپا تشکیل کے مشترک مقاصد [illegible] نقش [illegible]

---

[1] [illegible] ٹرونک کے COLLECTED WORKS [illegible]

ور منافرت کو یگانگت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ [1]

غرض، فنون لطیفہ اور ادبیات کے ایک ناقد کی حیثیت سے ہربرٹ ریڈ کو جو خصوصی شہرت حاصل ہے۔ اب اسے بتورِ خاص واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ فنونِ لطیفہ سے قطع نظر جہاں تک اس کی ادبی تنقید کا تعلق ہے اس کے مخصوص نفسیاتی نقطۂ نظر کا تعلق ہے تو اسے اس کے اپنے الفاظ میں یوں واضح کیا جا سکتا ہے:

"تنقید دراصل متن کے سلسلے کا نام ہے یہ عمومی تصورات کی دریافت اور توضیح کا عمل ہے لیکن ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے کہ دریافت کا یہ سفر ہمیں انسانی ذہن کے نامانوس اور عجیب و غریب گوشوں کی طرف بھی لے جا سکتا ہے۔" [2]

اس تعریف میں آخری سطر بہت معنی خیز ہے۔ بحیثیت ایک نقاد خود ہربرٹ ریڈ نے تخلیق کار کے ان دیکھے گوشوں سے خوفزدہ ہونے کے برعکس ان تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس نفسیات کی ہی کے باعث وہ تخلیق اور تخلیق کار کی شخصیت میں کمرے نفسی، بیٹھے کو زیادہ تسلیم کرتے تھے، بلکہ اس نے اس نظریہ کی روشنی میں شیلے، بائرن، کیٹس وغیرہ کا جو مطالعہ کیا، دنیائے ادب میں وہ اب خصوصی شہرت حاصل کر چکا ہے اس کے بقول:

"یہ عقیدہ ہے کہ شاعر کی شخصیت کی مکمل تفہیم سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ شاعر کی تحسین کے لیے بہترین اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔" [3]

علمی خدمات کے اعتراف میں ہربرٹ ریڈ کو سر کا خطاب دیا گیا اس کی بعض معروف تصانیف

1- H WESTMN. "SPRINGS OF CREATIVITY (PREFACE) P.169

2- "COLLECTED ESSAYS IN LITERARY CRITICISM" P-143

3- "THE TRUE VOICE OF FEELING" P-246

کے نام یہ ہیں۔

1. ART AND INDUSTRY، 1934

2. ART AND SOCIETY 1945

3. ART NOW 1954

4. ART AND SCULPTURE 1954

5. FORM IN MODERN POETRY 1948

6. FORMS OF THINGS UNKNOWN، 1960

7- HENRY MOORE 1965

8- "THE MEANING OF ART" 1945

9. POETRY AND ANARCHISM 1946

10- "SURREALISM 1936

11. THE TENTH MUSE 1957

12. "MY TRUE VOICE OF FEELINGS" 1953

13. MOORE, NORTH 1965

ہربرٹ ریڈ کی فنی شخصیت اور کتابیات کے لیے روبن سیمن [illegible] کی مرتبہ کتاب سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ SYMPO- [illegible] A MEMORIAL

[illegible] تو یہ ہے کہ مختصر تعارف جو میں نے [illegible] جب وہ اپنے وطن میں ایک متنازعہ فیہ شخصیت بن چکے تھے مگر یورپ میں [illegible] فکر و خیال کی عظمت کا اعلان ہے کہ [illegible]

ہوئے نہ تو عدم کے بارے میں سرپرستانہ اور مشفقانہ رویہ اختیار کیا اور نہ ہی فکرِ اقبال کی
دعوت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت محسوس کی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ تو اقبال کے
حرکی و پُرقوت افکار سے اس قدر مسحور ہوا کہ اگر ایک طرف اس نے اپنے عہد کے رومانی شاعروں
کا کتنے مطلوب انداز سے ہی گھسے ہوئے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے پر مذاق اڑایا ہے تو دوسری طرف وہ ملارمے
کو بھی اور نطشے اور امریکی شاعر والٹ وہٹمن پر غیر مشروط طنز نہیں نوازتا ہے۔ مغرب
اور مشرق کے ان اقبال شناسوں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ جو خود سر اقبال کی تردید کے باوجود اب
تک نطشے اور اس کے فوق البشر کا راگ الاپے جا رہے ہیں جبکہ بقول ہربرٹ ریڈ:

"جنید اقبال نے بطور خاص خود پر نطشے کے اثرات کی نفی کی ہے مگر پھر بھی وہ تقابلی
مطالعے سے نہیں بچ سکتے کیونکہ نطشے کے فوق البشر اور اقبال کے انسانِ کامل میں صرف
چند اتفاقی خصائص ہی مابہ الامتیاز ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ نطشے کی اساس
تصوف کی جھوٹی معاشرت پر استوار ہے جبکہ میری دانست میں اقبال کا تصور زیادہ
مادہ بنیادوں پر مستحکم ہے کہ اس میں سقراط حضرت مسیح اور حضرت محمد صلعم کی صورت
میں جو مثالی شخصیات دی گئیں انہیں اپنی اصل میں کسی مخصوص سماج کا عطیہ یا پہلے سے
متعین شدہ سمجھنے کے برعکس فطرت کی تخلیقی فعلیت کا اظہار قرار دیا گیا ہے۔ اپنی
نسل کے اعتبار سے اقبال کا مردِ کامل جمہوری ہے اور وہ لیبرل روحانی مسلمان ہے جس
کی اساس اس امر پر استوار ہوتی ہے کہ ہر انسان خلیفۃ اللہ حیثیتوں کا مرکز ہے، چنانچہ اس
خاص نوع کا طرزِ عمل بنا کر ان صلاحیتوں سے وابستہ امکانات کو بروئے کار لایا جا سکتا
ہے۔ یہ مثالی تصور ہی فکر حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔

اس موقع پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ہربرٹ ریڈ کے پایہ کے نفسیاتی نقاد کو علامہ اقبال کی شاعری میں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سب دو سب کتاب ہندوؤں کی وید، زرتشتوں کی "ژند" اور "اوستا"، یہودیوں کی "تالمود" اور "عہد نامہ قدیم"، مسیح اور ان کے حواریوں کی "اناجیل"، مکالمات افلاطون، قرآن مجید، منسوخ کا ریڈا اور جاوے اپنے عہد میں سوبدن بک تک یا اسی نوع کی دیگر قابل قدر کتب جیسے بیکن، کانٹ اور ہیگل کی تصانیف، یہ در بعض ایسی ہی مستلزمات جن میں فرد اور قوت انسانی جذبات کے ملوث نوں اور مادی دنیا کے کرشموں کی عقدہ طرازی کے باوجود ان کا مذہبی ہے، اس زندگیت سے آگہی، مستقبل کا شعور، نامعلوم کا احساس، بالی مت سدا، دریا ہمارا طرف سے ہم پر حاوی حقیقت علی کا ادراک، ان سب سے ان کا دامن تہی نہیں ہوتا اور یہ بالواسطہ طور پر ان میں رنگ آمیزی کرتے ہیں، ان ہی سے وہ کی اصل عظمت، رفعت اور احساس ہوتا ہے۔ وہ عظمت جو زمین کے پہاڑوں جیسی بلندی کا منظر پیش کرتی ہے۔

ان خیالات کی بنا پر گرہم ہربرٹ ریڈ نے علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ البتہ فکر اقبال سے اس کا صرف نظریاتی تعجب نہ ہوتا۔

نوٹ: ہربرٹ ریڈ کے متذکرہ مقالہ کا ترجمہ راقم فنون (اقبال نمبر ۱۹۷۷ء) اور راقم ہی کی مرتبہ اقبال — مدوّن عامہ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اقبال، ممدوحِ عالم

وہ شاعر کم عیار نہیں، جہاں منطق ناکام ہوتی ہے وہاں اس کی شاعری ذہن کو جلا بخشتی اور قائل کرتی ہے اس کا شاعرانہ پیغام محض ہندی مسلمانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ اس نے عالم اسلام کو مخاطب کیا اس لئے وہ ہندوستانی زبانوں کی بجائے فارسی میں داد سخن دیتا ہے اظہار کے لیے فارسی کا انتخاب اس بناء پر خوشگوار ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان فارسی زبان و ادب سے مانوس ہیں۔ فارسی زبان فلسفیانہ خیالات کے ابلاغ کے لیے موزوں بھی ہے اور دلکش بھی، اقبال ایک پیغمبر کے روپ میں آتا ہے اور اپنے زمانے کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں سے بھی مخاطب ہوتا ہے:

'من نوائے شاعرِ فرداستم

—— پروفیسر آر۔ اے نکلسن ۱۹۲۰ء

"یہ بھی ہمارے شہنشاہانہ طرزِ حکومت کا ایک کرشمہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر جس کا نام گزشتہ دس برس سے اس کے ہم وطن مسلمانانِ ہند میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے اس کے کلام کا ترجمہ اس قدر عرصہ کے بعد جا کر ہماری زبان میں ہو سکے۔ ہندوؤں میں جو مرتبہ ٹیگور کو حاصل ہے وہی مسلمانوں میں اقبال کو ہے اور زیادہ صحیح طور پر ہے اس لئے کہ ٹیگور کو بنگال کے باہر اس وقت تک کسی نے نہ پوچھا جب تک وہ یورپ جا کر نوبل پرائز نہ حاصل

کرنا ہے بخلاف اس کے اقبال کی شہرت و ناموری یورپ کی عنایت سے بالکل مستغنی ہے
مجھ کو رہی علی گڑھ و لکھنؤ حیدرآباد و حیدرآباد سب اس کی ذہانت نقد و شاعرانہ عظمت
و تسلیم کر چکے ہیں لیا لندن بھی اس فتویٰ پر مہر تصدیق لگائے گا؟

——— ای۔ ایم فارسٹر ۱۹۲۰ء

(شاعری میں ماہر جمالیاتی صداقتوں کے معیار پر پورا اترنے سے تعلق ہے
ہی جب تو کہیے کہ ایک ہی زندہ شاعر نظر آتا ہے جو معیار پر ثابت ہوتا ہے اور یہ ہیں
طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدہ اور نسل کا شاعر ہے جس نے میری مراد کی زبان سے
ہے ... آج جبکہ ہمارے مقامی شعراء اپنے بے تکلف احباب کے حلقے میں بیٹھے ہیں
کے تتبع میں کتے بلیوں اور ایسے ہی کم موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو کہیے
میں ایک ایسی نظم تخلیق کی ہے جس کے بارے میں میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ
مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔

——— سر جیرارڈ ریڈ ۱۹۲۱ء

مغرب کے لیے، جو اقبال کے مقصد کو ذہنی گرفت میں لینا چاہتے ہیں
ہے کہ وہ یہ ادراک کریں کہ اقبال کے کلام میں ویسی ہی مہک ہے جو پیغمبر موسیٰ یا حواری
پادری میں پائی جاتی ہے ہم اہل مغرب بعض اوقات خیال کرتے ہیں کہ مشرقی شاعر کو
کسی حد تک نرم مقدار اور جذباتی ہونا چاہیے تو اقبال مبہم اور ذاتی طور پر وجد آفریں
ہوتا ہے مگر ہمیں اس کی شرائط سے سابقہ پڑے تو احساس ہوگا کہ اقبال کے کلام کا
حصہ تند و تیز ہے اس تندی سے ہمیں آشنا ہونا چاہیے کیونکہ اس کی جڑیں سائنسی فکر
کی ... ادراک شدت میں پیوست ہیں۔ اگر ایک مغربی میسانی کی حیثیت سے اپنے آپ

سے پوچھیں کہ کس مقام پر اقبال مجھ سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے تو میرا جواب ہوگا کہ میں اسے واضح طور پر اور بے کم و کاست اس وقت سمجھ پاتی ہوں جب وہ مجھے اُردو ہاتھوں لیتا ہے۔

——— ڈاکٹر شیلا میکڈونلڈ ۱۹۶۶ء

اقبال کے عہد میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف انقلابی دانشوروں نے جس جدوجہد کا آغاز کر رکھا تھا اقبال کے انقلابی تصورات اس فضا کے عین مطابق تھے۔ اقبال درحقیقت معاشرت میں واضح طبقاتی نظام کے خلاف عمل پیرا ہونے کی ہمت اور ضرورت پر زور دے رہا تھا وہ طبقاتی نظام جو اپنی انتہائی پذیر صورت میں شر کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس عہد کی مخصوص اخلاقیات کی ہم نوائی کے برعکس اقبال نے نافرمانی، احتجاج حتیٰ کہ بغاوت کو بھی نوآبادیاتی نظام کے خلاف عملی جدوجہد میں شامل لوگوں کے لیے اعلیٰ اوصاف قرار دیا۔

——— ماریا سٹے پیٹیس ۱۹۰۰ء

بیدلے گر رفت اقبالے رسید — بیدلاں را نوبت حالے رسید

قرن ما مختصر فاحمہ اقبال گشت — واحد کز صد ہزاراں برتر گشت

جیبے گشت از سخن گوئی بپا — گفت مل اسپیدی چون صفا

شاہ ایں کشور جیشے تازہ دار — دیں مبارز کرد ما را صد سوار

ایں سلامے می فرستم سوئے یار

بے ریا تر از نسیم نوبہار

——— ملک الشعرا بہار (ایران)

عربی پہوی مرد فعل زہر — ز افتخار پرداختہ و اعتزاز

کلمات تضمنت کل معنی — سر دیار الاسلام فی ایجاز

بلسان القرآن خطت فیہ نغمات التنزیل والرائب:

فاقتلزہا، علی منوال قدسی

ذکی فی الہند ارمغانہ الحجاز

—— ڈاکٹر عبدالوہاب عزام رحمہ

اقبال

اقبال ——— جس کے ساتھ حق کی نعمت ہاتھ رہتی ہے ...

تو ان سے دوستی تھی

جس کی ہوا میں جس کے خسارے کو خوف تھا ...

جمیعت مخدوم کی تیری تھی نہ جادو نہ شب ...

اس کی نظر سے ہند کی نئی نسلوں کے خواب مرتب کے

لب اقبال ۔ معجز بیان لب اقبال

—— محمد زبیر ... حسینی

—— بیا یہ ناقدین اور شعرا سچ بول رہے ہیں؟

دیکھ ایک بات تو ... کہ ان ناقدین نے ...

... کہنا ... سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال کیسے ...

... اہمیت ... کہ ... ہونے کے باعث ...

... ہی ... حکومت کی سرپرستی میں اقبال شناسی کے ...

بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں ملک کا پریس اور نشر و اشاعت کے دیگر ادارے بھی اس ضمن میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں اس لئے اقبال ممدوح پاکستان تو سمجھ میں آتا ہے لیکن عالمی سطح پر یہ تحسین قابل توجہ بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اس لئے کہ اقبال پر بھی وقتاً فوقتاً جو اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں ان کی بنا پر اپنی زندگی ہی میں اقبال کو کم نظر مسلمان، محدود اسلامی فلسفے کا حامل، تصوف ناشناس، حافظ دشمن، نشاۃ ثانیہ اور ایک وقت لینن اور سٹالین کا یکساں قرار دیا جاتا رہا۔ واضح رہے کہ مقصد افادیت کے پیش نظر کسی ایک نقاد یا مکتب فکر کے حامل افراد کی جانب سے نہ لگائے گئے بلکہ مختلف اوقات میں مخصوص مقاصد کے تحت پیش کیے جاتے رہے اور حسب ضرورت یا مخصوص سیاسی حالات کی بنا پر کبھی تو کبھی مغرب نے۔

اقبال کو ان الزامات کا مرتکب ٹھہرایا جاتا رہا ہے وہ اپنے تئیں نہ شاعر کی تعریف پر پورا اترتے ہیں نہ صوفی نہ ہوں یا تجزیہ و تحلیل سے فکری سطح پر ان کے صادق یا خیر مستقل ہونے کا پتہ نہ چل سکتا ہو جب منطقی تجزیہ یا فکری تحلیل کی صلاحیت تو ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہوتی اسلئے اپنے سیاسی دباؤ سے اشعار کو الگ کر کے مخصوص وقتی ضرورت کے تحت ان کے جواز پر تو اور بھی ان کے نتیجہ میں فکر اقبال عجیب مجموعۂ اضداد نظر آتا ہے۔ وہ زیادہ تر سوشلسٹ، قوم پرست، آزادی نسواں کے حامی اور مخالفین مزدور، مخالف علم

سید، العزیز سبھی اقبال کے اشعار پڑھنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی کبھی وہ لفظ میں
اور کبھی واضح طور پر یہ سوال بھی کیا جاتا رہا کہ کیا اقبال کے کلام میں آفاقیت ہے؟ پاکستان
بننے کے بعد اقبال کے متذکرہ بالا تصورات کو ختم کر دیا گیا اور ناقدین نے اپنے اپنے طور پر
ان سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ جوازات بھی مہیا کر دیے جن کی روشنی میں اقبال کے ایک
وقت روسی، لینن، مارکس، نطشے اور مسولینی سے متاثر ہونے کا مدعا ہے۔ یہ بات کہیں نہ
سوال بے حد اہم ہے کہ اقبال کی بین الاقوامی تعلیمات کا سوال کیا ہے اور وہ
تعلق ہے۔

ڈاکٹر احمد نے اپنے مضمون "اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ" میں اس رائے کا اظہار کیا ہے
"اقبال کا سارا کلام پڑھنے کے بعد ایک سیدھی سادی بات تو ایک عامی کی سمجھ میں
آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانے اور ان سے کام لے خدا کے
رسول سے عشق رکھے اسلامی تعلیمات کی روح کو سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ حقیقت
میں خدا کا جانشین بن سکتا ہے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ
کچھ ہے وہ اقبال کے خصوصی اسالیب کے لیے مختص ہے اس لیے فہم عام کا سوال نہیں
اٹھانا چاہیے۔ اقبال کی آفاقیت اس مرکزی بات کو شاعرانہ طور پر پیش کرنے ہی میں پنہاں
ہے نہ کہ فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کے جواب میں۔ اقبال کے کلام کا وہی حصہ میری رائے میں آفاقی
ہے جس میں فلسفیانہ نکتہ طرازیاں نہیں ہیں کیونکہ اس کلام میں شعریت ہے اور عام اپیل
ہے اور اس میں عالمگیر اپیل بھی ہے۔"[۱۱]

---

(۱۱) ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۶۳ء

عزیز احمد کے استدلال کی اساس اس منطقی مغالطہ پر استوار ہے کہ انہوں نے کلام اقبال میں معانی (فلسفہ) اور اظہار (شعریت) کو دو الگ الگ چیزیں باور کر کے اور ایک کو دوسرے سے منقطع کر کے ان کا مطالعہ کیا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اور جیسا کہ اقبال نے متعدد خطوط میں بار بار زور دے کر لکھا۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔۔۔۔ فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہاں! بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مرد فرود دست

کہ بر من تہمت شعر و سخن بست" [1]

تعجب ہے اپنے لئے تہمت سمجھتے ہیں عزیز احمد اس پر اقبال کی آفاقیت کی اساس استوار کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اقبال کے بارے میں غیر ملکی ناقدین کے مقامات سے بھی اس استدلال کی عملاً تکذیب ہو جاتی ہے کہ اگر اقبال کے کلام میں آفاقیت نہ ہوتی، اگر ان کے فکار ہیں اقوامی سوچ کے معاییر کو نہ چھو سکتے اور اگر ان کے تصورات میں عالمی ذہانت کے لیے تسخیر بننے کی صلاحیت نہ ہوتی تو آج ہمیں دنیا کے بیشتر ممالک میں اقبال پر کتابیں، مقالات اور تراجم نہ ملتے آخر کیا وجہ ہے کہ امریکہ، جاپان، روس، آسٹریلیا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، چیکوسلوکیہ سے لے کر ایران، مصر، افغانستان، ترکی، مراکش، ملائیشیا حتیٰ کہ

---

[1] "اقبال نامہ" ص: ۱۹۶

مصری سنگاپور میں زندہ ہیں قبال شناس ہیں۔ جاوید کلام اقبال کے تراجم بھی دستیاب ہیں۔ اسلامی ملکوں میں تو اقبال پسندی کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے لیکن غیر اسلامی ممالک میں اس سے بھی بڑھ کر اشتراکی ممالک کی قبال کے افکار و تصورات میں دلچسپی کا کیا جواز ہے۔ ظاہر ہے کہ روس نما بلد یہ تمام ممالک اقبال کے شاعرانہ محاسن و شعریت کے دیدہ تو ہوتے رہے، شاید اسی لیے ٹلی کے پروفیسر ڈی۔ تورچی [illegible] اقبال پر اپنی تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ

ہم اطالیوں سے شناسائی کرانے کے لیے مشرقی دنیا میں
کے اس عظیم اطالوی نشاۃ ثانیہ میں اس عظیم شاعر کی یاد منائی جا رہی ہے۔

مقصد ہمارے ملک کے مہذب لوگوں کو مشرق کی روحانی روایات میں [illegible]
اقدار میں شریک کرنا ہے۔

وہ اس ضمن میں مزید رقمطراز ہیں۔

لہٰذا ہم اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے [illegible]
رہ سکتے ہیں کہ شاید یہ دور سب لوگوں سے زیادہ [illegible]
جس کا زوردار پیغام صرف مہذب لوگوں ہی کے لیے نہیں بلکہ [illegible]
کے لیے ہے جو اشتراکی [illegible] انسانیت کی تقدیر سے مایوس نہیں ہوئے۔
ماکش کے پروفیسر [illegible] نے اقبال کو [illegible]

اقبال ایک [illegible] ہیں آپ کی [illegible]
ان میں تمام دنیا کے انسان جو امتیاز نسل و ملک سے بالاتر ہیں آپ فطرت
انسانی کے علمبردار ہیں اس لیے اقبال کو مشرق و مغرب میں یکساں عزت حاصل ہے۔

ان دونوں ناقدین نے جغرافیائی بُعد کے باوجود اقبال کی ایک ہی مشترک خصوصیت پر زور دیا ہے اور وہ ہے ان کی عالم گیر انسانیت۔ اس لئے اگر سری لنکا کے تیسا ویجے رتن (TISSA W JEYERATNE) نے اپنا مضمون ان سطور پر ختم کیا تو وجہ سمجھنی دشوار نہیں۔

"یہی وہ پیغام تھا جس کی انسان دوستی نے ان کی شاعرانہ کشش کو عالم گیر بنا ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی محفل سخن گرم ہو، خواہ وہ مسلم پاکستان ہو یا ہندو بنگال، ایران ہو یا روس کی کوئی اسلامی جمہوریہ چین ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کے مسیحی طلبا کا اجتماع یا بدھ طالب علموں کی کوئی ایسی ہی محفل! ہر جگہ وہ نغمے خاص توجہ سے سنے جائیں گے جنہیں اسلامی احیاء کے داعی محمد اقبال کے قلم نے غیر فانی بنا دیا ہے!

رہے اقبال کے شاعرانہ محاسن تو ان کے متعلق میں امریکہ کی ڈاکٹر شیلا میکڈونف (SHEILA MCDONOUGH) نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

"ہمیں یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ان کی شعری زبان کی جڑیں اردو اور فارسی شاعری کی قدیم اور شاندار روایات میں پیوست ہیں لہٰذا کوئی بھی یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ اقبال کی تصویر کاری سے اُبھرنے والے تمام کنائے اور مضمرات اس کی سمجھ میں آگئے ہیں، بالخصوص ان اذہان میں جو اقبال کی مانند مسلمانوں کے ادبی ورثہ سے واقف نہیں۔"

ان چند آراء اور "اقبال حدودِ عالم" میں شامل مقالات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے،

سے یہ بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک نہ صرف اقبال کے نام سے آشنا ہیں بلکہ بعض ممالک جیسے ایران، مصر، ترکی، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں تو اقبال شناسی کی باقاعدہ روایت ملتی ہے کیا یہ تمام ممالک یکساں طرزِ احساس کے حامل ہیں جو یہ اقبال کے مداح ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں بلکہ روس اور امریکہ میں تو سیاسی نظام کے باعث فکری سطح پر بعد مشرقین ملتا ہے لیکن اقبال کے معاملہ میں یہ دونوں ہاتھ ملاتے نظر آتے ہیں

اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت کے پیشِ نظر علامہ اقبال میں آفاقیت کا مسئلہ حل کے لیے کسی نظریاتی بحث سے ہٹ کر اب عملی صداقت کا روپ دھار چکا ہے۔ یہ تو آفتاب آمد دلیلِ آفتاب والی بات ہے۔ اس ضمن میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہیے کہ مختلف ممالک میں اقبال شناسی کے آغاز اور پھر ایک باضابطہ فکری روایت بننے کا باعث ہماری یا دوسری حکومتوں کی سرپرستی نہ تھی یہ درست ہے کہ کبھی کبھار غلطی سے ہمارے سفارت خانوں نے بھی یومِ اقبال کا اہتمام کیا ہو گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سعد، آربری، ہارٹ ریڈ، ای ایم فارسٹر، برطانیہ، این میری شمل، مغربی جرمنی، یونس ایمرے، لوئس کلوڈ میتخ، فرانس، کورڈن پولسکایا، نتالیا پری کارینا اور ماریا سے ویں نیتیس روس ایسی شخصیات محض ہمارے سفیروں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اقبال کو اپنا موضوع نہ بنا سکتی تھیں۔

(۲)

بین الاقوامی سطح پر اقبال کی تحسین کا باعث تلاش کرنے میں خارجی عوامل کے بجائے خود علامہ کے کلام میں تلاش کرنا زیادہ سود مند ثابت ہو گا کہ اس نے ناقدین کو متاثر کیا تھا۔ دوسرا یہ کہ اقبال نے جب خود کو برصغیر کے روایتی شعراء سے متاثر نہ چاہا تو اپنے

پیغام کی آفاقیت کی بناء پر انہیں یقیناً یہ احساس ہوگا کہ میں ان سب سے الگ ہوں کہ میرا فلسفۂ زیست ان سب سے جداگانہ ہے۔ اقبال کو ورثہ میں گل و بلبل کی غزل اور اس کا نامردانہ عشق ملا تھا جس میں لکھنوی شعراء نے اپنے ابتذال، ہزل اور مریضانہ جنسیت سے مزید گل کھلائے ظاہر ہے کہ اقبال کے شاعرانہ مقاصد معاصر شعراء کے فنی نصب العین سے مماثلت نہ رکھتے تھے۔

اقبال نے جس نظام فلسفہ کی تشکیل کی اس کی اساس بعض اہم تصورات پر استوار تھی، خودی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ تصور عشق، عقل و وجدان کی آویزش، مغربی تہذیب سے اظہار بیزاری، سخت کوشی کی تلقین اور مرد مومن ـــــ یہ ہیں وہ تصورات جن سے فلسفۂ اقبال میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اقبال کے فکری ماخذات کی بنیاد قرآن مجید، مشرقی مفکرین اور مغربی فلاسفروں پر استوار ملتی ہے اور اس ترتیب سے ہی اقبال نے ان سے اثرات بھی قبول کئے۔[1] اس ضمن میں فرانسیسی خاتون لوس کلوڈ میتر (LUCE-CLAUDE MAITRE) نے اقبال پر اپنی کتاب "فکر اقبال کا تعارف" میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

---

[1] اسے ایک مثال سے یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ اپنے انسان کامل کے نظریہ کی تدوین میں اقبال نے نطشے سے کہیں پہلے آٹھویں صدی ہجری کے مسلم مفکر الجیلی سے اثرات قبول کئے اس حد تک کہ بمبئی کے انگریزی جریدہ INDIAN ANTIQUARY ستمبر ۱۹۰۰ء میں اس پر ایک مفصل مقالہ قلم بند کیا جس کا عنوان ہے۔

THE DOCTRINE OF ABSOLUTE UNITY AS EXPOUNDED BY ABDUL KARIM AL-JILANI.

حاشیہ جاری ـــــــــــ ص: ۲۰۰

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور وہ قرآن مجید سے اثرات قبول نہ کرے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکرِ اقبال قرآن مجید سے اخذ و قبول کرتا ہے اور نہیں تو کم از کم اس کی دیئے حدود کے لحاظ سے یہ بالکل درست ہے۔ شاعرِ قدم قدم پر قرآن مجید سے استفادہ کرتا ہے چنانچہ اس کے کلام میں آیات کے جو بار بار حوالے ملتے ہیں تو اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال ہمیشہ پیغمبرِ اسلام کی متعین کردہ راہِ مستقیم سے انحراف نہیں کرنا چاہتا۔"[1]

جس بات کو اس فرانسیسی فرانس نے ایک واضح حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے اس سے بات میں ہمارے مفکر اقبال شناس کا رویہ رعد رتی نہیں ہوتا تو مناظر سے تو یقیناً ہوتا

انجیلی کی معروف تالیف "انسانِ کامل" ہے۔ اقبال نے اس میں خود انجیلی کے اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے نطشے کے اثر کی تردید کی:

"اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں:

(نیرنگِ خیال۔ اقبال نمبر ۱۹۳۲ء)

ہمارے ناقدین کی کثرت اقبال کے اس تعارف کے وجود سے ناواقف ہے۔ اقبال کے انسانِ کامل پر لکھے گئے مقالات کا رنگ بھی ورنہ ہوتا۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالمجید ڈار کا انگریزی ترجمہ:

INTRODUCTION TO THE THOUGHT OF IQBAL - P: 27

(دو ترجمہ کے لیے ملاحظہ ہو: اقبال کا تعارف: ڈاکٹر۔ مطبوعہ شیخ محمد علی کیشنز۔ لاہور۔

ہے جس کے نتیجہ میں مقالہ معرکۂ حق و باطل کی صورت اختیار کر لیتا ہے لیکن اس کلوڈ کا رویہ بالکل حقیقت پسندانہ ہے ایک غیر مسلم ہونے اور پاکستانی نہ ہونے کے باعث وہ اقبال کی قرآن مجید سے بڑھی ہوئی دلچسپی کو زیادہ معروضی انداز میں دیکھنے کی اہل ثابت ہوئی اس حد تک کہ اسے فکر اقبال میں اساسی حیثیت قرار دیتے ہوئے اقبال کے لیے طرۂ امتیاز گردانتی ہے۔

"اسلام سے باہر فکر اقبال نے مسلم مفکرین سے برائے نام ہی استفادہ کیا ہے جبکہ حلقۂ اسلام میں صرف قرآن مجید کی تعلیمات اور رومی کے تصورات نے اسے بطور خاص متاثر کیا۔" [1]

جو قومی سطح پر جس احساس کمتری میں مبتلا ملتے ہیں اس کا مجموعی اظہار مختلف اوقات میں مختلف انداز سے ہوتا ہے۔ اس اجتماعی احساس کمتری، اس کے محرکات اور ردعمل کے متنوع مدارج کے تجزیاتی مطالعے کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا طے ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم فکری سطح پر سب سے بڑے متاثر رہے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کی اردو نثر اس کی گواہ ہے جس کی عام مثال آپ ہیں۔ ضرورت ملریزی الفاظ کا استعمال تو خاص وہ جسے اقبال نے اجنبیت کے احساس و تخیل کی گدائی سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ادبی تنقید، علوم اور مابعد الطبیعیات اور قدیمیات کے ضمن میں بالخصوص ہمارے ناقدین مغربی مفکرین اور دانشوروں کے سہارے اور حوالوں سے دوری کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اقبال پر بیشتر مقالات میں نطشے، ہیگل، برگساں، کانٹ ایسے ناموں کی تکرار ضرور ملے گی اس حد تک کہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال

---

[1] ملا عبدالمجید ڈار کا انگریزی ترجمہ : ص : ۳۰

پر مقالہ قلم بند کرنے کا جو ایک فارمولا بن چکا ہے تو یہ حوالاتی، مذہبی اس کا ایک جزو بن چکا ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ اکثریت نے ان تمام فلاسفروں کی کتابوں کا تفصیلی مطالعہ نہیں کیا ہوگا۔ بیشتر صورتوں میں تو یہ جزوی پڑھنے جیسی بات ہے۔ شاید ہی کوئی یہ محترم ناقدین نہیں بلکہ اقبال پر ان فلاسفروں کے اثر ثابت کرنے پر تلے نظر آتے ہیں۔ ان کے برعکس ان لوگوں نے حوالہ بازی کتاب میں اقبال پر یونانی فلسفے سے لے کر کانٹ، برگساں اور نطشے کے فلسفیانہ اثرات کی خاص تردید کی ہے مثلاً نطشے کے ضمن میں وہ رقم طراز ہیں۔

"بعض ناقدین نے اقبال پر نطشے کے فلسفیانہ اثرات کے بارے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی زور دیا ہے اس حد تک کہ گویا اقبال اس کا ایک ادنیٰ شاگرد ہو لیکن یہ انداز نظر غلط ہے اور کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔"[1]

جب نطشے ہی کی بات چلی ہے تو اس ضمن میں مرسٹ ریڈ کی رائے کا مطالعہ بھی لازم ہے جس نے ۱۹۲۱ء میں نہ صرف اقبال کے تصورِ انسانِ کامل کو سراہا بلکہ اقبال کو نطشے پر فوقیت بھی دی۔

"نطشے کی اساس اشراف کی چھوٹی معاشرت پر استوار ہے جبکہ میری دانست میں اقبال کا تصور زیادہ پائیدار بنیادوں پر مستحکم ہے کہ اس میں سقراط، حضرت مسیح اور حضرت محمد صلعم کی صورت میں جو مثالی شخصیات لی گئیں انہیں پہلی اصل میں کسی مخصوص سماج کا عطیہ یا پہلے سے متعین شدہ سمجھنے کے برعکس فطرت کی تخلیقی فعلیت کا اظہار قرار دیا گیا ہے۔"[2]

---

[1] ایضاً، ص: ۴۴

[2] "NEW AGE" 25 AUG. 1921..

ہربرٹ ریڈ کا یہ مضمون اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ یہ اسرار خودی کے ۱۹۲۰ء میں ترجمہ کے فوراً بعد لکھے جانے والے مقالات میں آتا ہے ہربرٹ ریڈ سے بیشتر صرف پروفیسر ڈکنسن اور ای ایم فارسٹر کے مضامین کے حوالے ملتے ہیں۔

[ان دونوں کے ترجمے معارف ستمبر ۱۹۲۱ء اور جون ۱۹۲۱ء میں چھپ چکے ہیں اقبال نے ان دونوں کے اعتراضات کے جواب میں جو مراسلہ پروفیسر نکلسن کو لکھا۔ اس کا ترجمہ بھی "معارف" (اکتوبر ۱۹۲۱ء) میں طبع ہوا اس کے بعد یہ بیرنگ خیال (اقبال نمبر ۱۹۳۲ء) میں بطور ایک مضمون "فلسفۂ سخت کوشی" شائع ہوا اور پھر "اقبالنامہ" میں شامل کیا گیا۔]

لیکن ان کے فوراً بعد لکھے جانے والے ہربرٹ ریڈ کے متذکرہ مضمون سے سب نا آشنا نکلے۔ یہ مضمون ایک تو اس لحاظ سے اہم ہے کہ اسے ہربرٹ ریڈ نے لکھا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اقبال کی زندگی میں ہی انہیں ہربرٹ ریڈ ایسا نقاد غیر مشروط الفاظ میں خراج تحسین پیش کر رہا تھا یہ امر اس لیے بھی اہم ہے کہ ابھی خود برصغیر کے مسلمانوں میں اقبال کی حیثیت خاصی متنازعہ فیہ تھی اور خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی ایسے بزرگوں نے اقبال کے خلاف حافظ اور تصوف کے نام پر باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ ان سب سے بڑھ کر یہ امر قابل توجہ ہے کہ ہربرٹ ریڈ نے اپنے معاصرین کی مانند "اسرار خودی" کو شک و شبہ یا خوف کی نگاہ سے نہ دیکھا اور نہ ڈکنسن کی مانند اقبال کو ستارۂ امن کی بجائے خونیں ستارہ قرار دیا بلکہ ہربرٹ ریڈ نے مغربی دنیا کے ان تمام شعراء پر اقبال کو فوقیت دی جو ابھی تک کیٹس کے حلقہ اثر سے ہی آزاد نہ ہو سکے اور اس نے ہم سے بڑھ کر اقبال کی شاعری کے مابعد الطبیعی پہلو کو سراہا۔ اس نے اپنے مضمون کے اختتام میں امریکی شاعر والٹ وہٹ مین اور جرمن فلاسفر نطشے پر اقبال کو فوقیت دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

نطشے اور وہٹ مین کے مقابلے میں اقبال نے اس صداقت کا زیادہ یقینی طور پر احساس کیا ہے۔ وہٹ مین کا ربانی اوسط خاصا مبہم ہے اور شاید ایک تصور اس میں توانائی کی شدت و انفعال نظر آتا ہے جبکہ نطشے کا فوق بشر سماج کا باغی ہے۔ لہٰذا جبلی طور پر ہمارے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اقبال کا مرد کامل تو خود ہی ربانی اوسط ہے اور دستور! اس کا ربانی اوسط بھی مرد کامل ہے۔ وہ صنم بھی ہے اور صنم پرست بھی!

ہمارے اقبال شناسوں کی اس مقالہ تک رسائی نہ ہو سکی ورنہ اب تک یہ مرحلے کی تکمیل ہو چکا ہوتا۔

(۴)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہے کہ اس مسئلہ کو قرآن سے ملا دیا ہے اور وہ بھی صرف دو ترمیموں کے ساتھ نظریۂ وراثت نسلی کا قائل اور وجود باری کا منکر تھا اقبال ان دونوں مسائل میں اس کے مخالف ہیں۔"[1]

اقبال کے مذہبی شغف کے ضمن میں یہ امر بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے کہ مغرب کے ناقدین کی اکثریت نے نہ صرف یہ کہ غیر جذباتی ہوئے بغیر معروضی انداز اپنایا بلکہ یہ بھی کہ انہوں نے اسے بطور خاص سراہا بھی ہے اٹلی میں اقبال کا مشہور مداح اسپندر رو بوزانی اس ضمن میں لکھتا ہے

"ایک ایسی دنیا میں جس نے مذہبی احساسات کو تقریباً فراموش کر دیا ہے اور خدا کو شخصیت کے لوازمات سے بیگانہ کر کے ایک حسن و کیف سے لبریز ہستی کو اشیاء اور تاریخ میں مبدل کر دیا ہے اقبال نے اپنے نغمۂ مریدی سے ہمیں پھر ایک مرد حق کی آواز سے روشناس کیا ہے ایک ایسی آواز جو جمالیات زمانہ کی آوازوں سے کہیں زیادہ دانتے کی آواز کے قریب ہے۔"[2]

سب سے اقبال کے نقاد کا بعض مغربی مصنفین نے مذہبی عقائد کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے جیسے کہ ایک انگریز، جیسے ٹامس برما کے اس ضمن میں دو قدر دان تھا۔ [illegible] کیفیت کی ذکر شیلی میکڈونلڈ نے [illegible] ہیں اور موخر الذکر نے صرف ۱۹۵۰ء تک کیمبرج کالج لاہور میں تقریباً ادبیات تقابلی مذاہب کی پروفیسر رہیں بلکہ انہوں نے غلام احمد پرویز کے مذہبی تصورات پر تحقیقی مقالہ

---

[1] غلام اقبال، بلبل ہندوستان، مطبوعہ معارف جولائی ۱۹۴۲ء

[2] دانتے اور اقبال، مطبوعہ ماہ نو، اکتوبر ۱۹۵۵ء

تھیسس کر INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ان کے مقالہ کا موضوع تھا۔

D. PERWEZ: A STUDY IN ISLAMIC MODERNISM

ڈاکٹر ایلیسن نے اقبال کے مذہبی شغف کی اساس پر سیالکوٹ میں چرچ سے وابستہ رہنما میں دیکھی ہے ان کے بقول:

اقبال کی تعلیم ایک مسیحی مشن سکول میں ہوئی اس کا غالب یقین کہ پرسبائٹیرین چرچ نے جس کے ساتھ پادری کی حیثیت سے ان کا تعلق تھا اقبال کے ذہن کو اوائل عمر میں کچھ نہ کچھ ضرور متاثر کیا ہوگا ..... میرے روحانی بھائیوں نے اقبال کو ابتدائی عمر میں ہی مذہب کی ایک توانا اور صحت مند شکل سے آشنا کر کے ان کی فکر اور نظریہ حیات کو تاب و توان بخشی۔ [1]

اس تقریر میں ڈاکٹر ایلیسن نے فلسفہ اقبال کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد کہا

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہم مسیحی لوگ اس نقطہ نظر سے مکمل طور پر متفق ہیں۔

میرے خیال میں فلسفہ اقبال کی تعبیر میں یہ ایک منفرد انداز نظر ہے کہ فلسفہ اقبال کو مسیحی نقطہ نظر سے سمجھ کر اسے سراہا جائے۔ ڈاکٹر ایلیسن مذہبی شخصیت ہیں اور اس حوالے سے انہوں نے اقبال کو سمجھنے کی سعی کی اور اسے اپنے مخصوص عقائد کے اعتبار سے ذرا بھی نہ پایا۔ شاید میکڈونلڈ انداز نہ ہو لیکن مذہبی نہیں لیکن مسیحی یقیناً اس نے اقبال کے ہاں

---

[1] تقریر مشمولہ اقبال ریویو اپریل ۱۹۶۷ء

کو اس کے درست تاریخی تناظر میں رکھ کر دیکھا تو یہ نتیجہ برآمد کیا:

"اگر میں ایک مغربی عیسائی کی حیثیت سے اپنے آپ سے پوچھوں کہ کس مقام پر اقبال مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے تو میرا جواب ہوگا کہ میں اسے واضح طور پر اور بے کم و کاست اس وقت سمجھ پاتی ہوں جب وہ مجھے آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔" [۱]

اس ضمن میں وہ مزید رقم طراز ہیں:

"اقبال کی اصل کوشش یہ نہیں تھی کہ عیسائیوں کو زیادہ دیانتدارانہ اور تعمیری ذاتی محاسبہ پر آمادہ کیا جائے بلکہ یہ کہ مسلمانوں کو جھنجھوڑا جائے تاکہ وہ اطمینان بالذات ایسی بدعادات اور غیر حقیقی آخرت کے بارے میں عقائد ترک کر دیں۔ اس لیے جب اقبال کسی عیسائی پر نشتر زنی کرتے ہیں تو میں ان کے خنجر کی کاٹ کو رگِ جاں پر محسوس کرتے ہوئے یہ اندازہ کر سکتی ہوں کہ مسلمانوں پر ان کی ضرب کس قدر کاری ہوتی ہوگی..... وہ خوابیدہ مسلمان جنہیں انہوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔

یہ انداز ایک دانشور کا ہے جس کی بنیاد اس احساس پر استوار ہے کہ اقبال محض ایک دور یا مسلمانوں کے لیے مخصوص نہ تھا اس کی شاعری میں چیزے دگر بھی ہے جو مشرق کی مانند مغرب کے لیے بھی سود مند ثابت ہو سکتی ہے چنانچہ اٹلی کے پروفیسر نی توپی کے بقول:

---

[۱] "THE MOSQUE OF CORDOVA: VISION OR PERISH"
مطبوعہ "اقبال ریویو" - اپریل ۱۹۶۷ء

اس اظہار عقیدت میں جو ایک دوست ملک کے عظیم شاعر کو
پیش کیا گیا ہے اس عظیم شاعر کو جو حق کی عالم گیر کشش کے تحت ہمارا شاعر بھی
ہے جانتے ہیں کہ ان دیرینہ تعلقات کی تجدید کا احساس مرتا ہوا ہے جو
اس روحانی دنیا سے متعلق کرتے ہیں جس کا اقبال نمائندہ تھا اور زبان حقائق بیان
اس اسلامی ثقافت سے ہے جو ہمارے ملک میں اپنی تاریخ اور فکر کے نقوش
ہمارا چھوڑتی ہے۔

فکر اقبال میں مذہب کی اہمیت کی تفہیم کے لیے تین مختلف زاویے ہیں بنا بریں اگر مسلمان
ہو کر قرآن دین کو ماننے کے لیے کوئی رائے کا اظہار کریں تو اس کی خیداں اہمیت ہے؟
لیکن ہم اس کے برعکس کہنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے لیکن مغربی ناقدین کا رویہ
کا خاصا ہے کہ اقبال کے ہاں اسلام محض مذہب ہے اسے مذہب کے طور پر نہیں
مذہب کے اس پہلو کو مغرب نے پہلے مسترد کر چکا ہے اگر ایک حد کی قوت و عمل
زیست میں سیرت فرد پیدا کرتے ہیں تو اقبال کا نام ہے شاید اس لیے
کہ اس سے بعد اقبال پر تنقید کے مسلمانوں کے غیض و غضب کے سوا کچھ نہیں
وقت ہے رشید احمد صدیقی اسلوب کے معیار پر اقبال کو تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا۔ ای یو نارسٹ نے ۱۹۵۶ء میں محمد اقبال کے نام سے ایک
مضمون بھی لکھا جس میں وہ کہتا ہے۔

اقبال کے مسلمان تو تھا مگر وہ کہہ رہا ہے یہ سنا رہا تھا

---

[1] تقریر مطبوعہ اقبال ریویو ۱۰ اپریل ۱۹۶۰ء

اس کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں مگر وہ انتہا پسند متعصب نہ تھا چنانچہ اس نے ہندوؤں اور عیسائیوں کا ہمیشہ ادب و احترام سے تذکرہ کیا۔ [illegible] جبکہ ہم نے روایت پرست ذہن کی روشنی میں اقبال کو محض ایک روایتی اسلامی شاعر کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اس لیے کبھی حافظ کا نام لے کر برا بھلا کہا تو کبھی وقت کے نام پر تکفیر کی!

اقبال کا فلسفہ عمل کا فلسفہ ہے جدوجہد کا فلسفہ ہے اور خارا شگافی کا فلسفہ ہے دیکھا جائے تو کرہ ارض کے ہم طبعاً سست لوگ اس فلسفہ کے اہل نہیں اور نہ ہی ہم اس فلسفہ کے عملی تسلیم کی زندہ تصویر بن سکتے ہیں فرانس نے اپنے انقلاب سے وابستہ اور [illegible] تحریروں کی صداقت کی گواہی دی جن قوموں نے ہیگل اور نطشے کا فوق البشر [illegible] روسیوں نے مارکس اور لینن نے مادر [illegible] کے افکار کی روشنی میں [illegible] تبدیل کیا [illegible] جب کہ اقبال کے ترکی پیلو کی [illegible] حالت میں نہیں رکھتے [illegible] کے اقبال شناسوں نے فکر اقبال کے [illegible] کو [illegible] نہیں [illegible] میں ہوا سے مذہب سے [illegible] کی [illegible] اہمیت ادا کرنے [illegible] اقبال [illegible] مقام [illegible] سیاست چنانچہ روس کی ممتاز مستشرق [illegible] ایلی [illegible] یوفسکایا [illegible] روس کے ممتاز علمی [illegible] اکیڈمی آف سائنسز کے انسٹی ٹیوٹ [illegible] ایشیا [illegible] ممتاز [illegible] ہیں، نے اپنے مقالہ اقبال کے سماجی نظریات میں اقبال [illegible]

— "TWO CHEERS FOR DEMOCRACY"

اظہار کیا!

پاکستان میں سماجی فلسفہ کو اب تک جو ترقی حاصل ہوئی ہے اس پر سب سے زیادہ اثر علامہ اقبال کے سماجی افکار اور نظریات کا پڑا ہے۔۔۔۔ اسلام کی جدید تفسیر اور اجتہاد کے حوالے سے تجربے والے نئے رجحانات کے دخیل، مجتہد اور مفسر علامہ اقبال ہیں۔ اپنی تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلام" کے ذریعے علامہ اقبال نے مذہب کو نوآبادیاتی نظام کے مخالف ترقی پسندانہ افکار و نظریات کے فلسفیانہ پس منظر کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے اس جذبے سے ایک نیا سماجی فلسفہ بھی پیش کیا۔ یہ سماجی فلسفہ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے سامراج دشمن محسوسات کی غمازی اور عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اس طبقے کی سرمایہ دارانہ دشمن امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ فلسفہ اس بات پر منحصر ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی اور اس کرۂ ارض پر بھی اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے انسانوں کے درمیان مساوات کے زبردست حامی اور علمبردار ہیں!

بائبل اور روسی مستشرق خاتون ایرینا سٹیپانوفا (IRENA STEPANOVA) نے بھی اقبال کے افکار کے انقلابی پہلو کو غیر منقسم ہندوستان کے مخصوص حالات کے تناظر میں مکمل طور پر مذہب سے اپنے مقام کے فلسفہ اقبال میں خلافیات سے مماثل قرار دیا ہے۔

خطاب کے مطابق نوآبادیاتی نظام کے خلاف انقلابی نظریات

جس جدوجہد کا آغاز کر رکھا تھا اقبال کے یہ انقلابی تصورات اس فضا کے عین مطابق تھے چنانچہ اقبال کے اس تصور نے کہ شر صرف مسرور نہیں ہے ان دانشوروں کو بالخصوص متاثر کیا کہ اس کی رو سے وہ تمام سماجی خرابیوں کا منبع خارجی حالات کے شر یعنی جاگیردارانہ نظام اور نوآبادی سیاست میں تلاش کر سکتے تھے۔

روس کی مانند مغرب کا باعمل ذہن بھی اقبال کے فلسفۂ جدوجہد کو صحیح معنوں میں پسند کر سکتا چنانچہ ٹیلی کے پروفیسر جی توچی نے اس نقطۂ نظر سے اقبال کو سراہا ہے۔ ان کے بقول:۔

"یہ افہام و تفہیم اور امن کا منصوبہ ہے لیکن ذات کی خود سپردگی اور تصوف کے ذریعہ نہیں بلکہ جہد و عمل کے ذریعے۔ ایسا جہد و عمل جو یقین رکھنے والے کو شرف بخشے اور ارفع و اعلیٰ بنا دے۔ اقبال ایسا یقین رکھنے والے شخص کو لیونارڈو کے الفاظ میں ایسا آدمی قرار دیتا ہے جو محض کھا پی کر زندگی بسر کرنے کا انتخاب نہیں کرتا یہ تو ایسی جدوجہد کا قائل ہے جو نہ تو اسے اس کے مخالف راستے پر چلنے والوں سے الجھاتی ہے اور نہ ہی دوسرے رستے پر جانے والوں سے بلکہ یہ تو اسے حکم الٰہی کا اہل اور قابل بناتی ہے۔"

اس کے برعکس مشرقی ممالک کے ناقدین نے اقبال کے اس پہلو سے زیادہ شغف کا اظہار نہ کیا بلکہ فلسفۂ اقبال کے مابعد الطبیعاتی پہلوؤں کی تشریح و توضیح میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی۔

ایران میں اقبال شناسی کی روایت

اقبال شناسی کی روایت کا عالمی سطح پر مطالعہ کریں تو عجب یہ نقاد حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال شاعر اسلام تھے لیکن عالم اسلام کے مقابلے میں مغربی ممالک میں ان کے فکر و فن سے نہ صرف یہ کہ اربابِ دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا بلکہ ہربرٹ ریڈ ایسے نقاد کی صورت میں انہیں غیر مشروط مداح بھی مل گئے۔

علامہ اقبال نے "اسرارِ خودی" (۱۹۱۵ء) کی اشاعت کے بعد اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر پروفیسر آر اے نکلسن کو پیش کیا تو وہ اس کے مطالعے سے اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً اس کے ترجمے کی خواہش کا اظہار کیا چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب اس کا انگریزی ترجمہ طبع ہوا تو علامہ اقبال اہل دانش، محققین و مستشرقین سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اس ترجمے سے متاثر ہو کر ہربرٹ ریڈ نے اسرارِ خودی پر ایک مضمون میں علامہ کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جرمن فلاسفر نیٹشے اور مرزا غالب و ملٹن پر اقبال کو فوقیت دیتے ہوئے لکھا۔

شاعری میں مابعد الطبیعیاتی معاملات کے معیار پر اگر آج کے اپنے شعراء کی پرکھ کی جائے تو مجھے صرف ایک ہی ایسا زندہ شاعر نظر آتا ہے جو کہ معیار پر ثابت ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدے، دو نسل کا شاعر ہے۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے۔ آج جبکہ ہمارے مقامی مشاعرے اپنے بے تکلف احباب کے حلقے میں بیٹھے کیٹس کے تتبع میں کئے جاتے ہیں اور ایسے ہی کھرے

[illegible]

[illegible]

یہ تو تھا یورپ کا حال جہاں [illegible] اشتراک تھی [illegible]

[illegible] مشرق و مغرب جتنا فاصلہ تھا اس کے برعکس [illegible]

انتہا اتنے مختلف نہ تھے جتنا کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کتابات [illegible]

[illegible] وقت [illegible]

[illegible] تخصیص کی محدود [illegible]

لکھتی ہے [2]

جہاں تک "فردوسی کے ہزار سالہ جشن ولادت کے منتظمین" کا تعلق ہے [illegible]

[illegible] لاہور [illegible] سید محمد فرید صاحب [illegible] کے ساتھ [illegible]

یہ [illegible] نے [illegible] کی [illegible]

[illegible] کے کلام کی [illegible] پر [illegible] کے بعد [illegible]

[illegible] ہے کہ [illegible] سے متعلق [illegible]

[illegible]

۲۔ مقالہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] صفحہ [illegible] "ماہنامہ [illegible]

کو ہر ان کبھوں نہیں بلایا گیا اور ان کے بجائے ٹیگور نے برصغیر کی نمائندگی کی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے علامہ کو ایران آنے کی دعوت دینے کی تجویز علی اصغر حکمت کے سامنے پیش کی تھی جو برصغیر میں ایران کے سفیر رہ چکے ہیں اور جنہوں نے ڈاکٹر تارا چند کی معاونت سے اسرار میں ہند نامی ایک ضخیم کتاب مرتب کی ہے۔ بعد میں وہ وزیر معارف کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ استاد فروزانفر نے فرمایا کہ افسوس ہے کہ میری تجویز جامہ عمل نہ پہن سکی۔

طریقہ یہ ہے کہ بعد میں بدلے حالات کے تحت علی اصغر حکمت نے علامہ اقبال کو یوں خراج عقیدت پیش کیا:

اقبال کہ آفتاب تابندہ ماست — نامش بحساب دولت پائندہ ماست
عام خدمات و در بود خضر زمان — آب سخنش روح فزائندہ ماست
اقبال کہ ستارہ روشن کہکشاں ماست — فیض سخنش دولت جاں پرور ماست

آنجا کہ درخشد بہ یکدیگر و
خورشید بسان ذرہ در منظر ماست

واضح ہو کہ یہ وہ وقت تھا جب علامہ اقبال کی شہرت اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی انہیں ڈاکٹر کا خطاب مل چکا تھا ملک میں منعقدہ دو گول میز کانفرنسوں میں وہ مسلمانوں کی نمائندگی کر چکے تھے، فرانس میں برگساں ایسے نامور فلسفی اور ادیب میں مسولینی سے ملاقات کر چکے تھے اور سپین کے علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا دورہ کر کے وہاں کی حکومت کو تعلیمی اصلاحات کے لئے بعض اہم تجاویز پیش

۱۔ مجلہ "ہلال" کراچی، ۴/۱۲ اگست ۱۹۶۵ء)

کر چکے تھے ۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں فردوسی کی تقریبات پر مسلمانان ہند کی ترجمانی کر سکتے تھے
مقالات علامہ محمد اقبال مخزون ہیں۔ ان کو قومی شہرت کے خیال سے مفکر مسلمان [illegible]
تیار کر چکے تھے لیکن یہ ان میں اقبال شناسی کا یہ عالم تھا کہ سید محمد حسین طباطبائی سے جب
یکم اردی بہشت ۱۳۰۷ شمسی ۲ اپریل ۱۹۲۸ء کو جب انہوں نے عازم
جہاں جاوید ہوئے تو اس وقت ایران میں اقبالیات کے بارے میں کوئی تالیف [illegible]
[illegible] صرف تین [illegible] کی [illegible] پر [illegible]
ان کا سرمایہ ایک قطعہ، دو دو تین تین [illegible] کا بل [illegible]

اس کے ساتھ ہی [illegible] کے [illegible] اور [illegible]
[illegible] کے [illegible] سے [illegible] کی تصویر کے خدوخال کافی سے زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

۱۹۲۴ء کا واقعہ ہے کہ سابقہ حکومت ہند کی دعوت پر دانشور ایران کا ایک وفد [illegible]
کے تعلیمی ادارے [illegible] دیکھنے کی غرض سے [illegible] ہوا جانوں نے [illegible]
[illegible] وغیرہ کا دورہ کیا اور اکبر [illegible] دہلی میں [illegible] جاری [illegible]
متعلق استفسار کیا تو اسے یہ جواب ملا کہ ایران میں اقبال کو کوئی نہیں جانتا [illegible]

لے سید محمد محیط طباطبائی نے اپنے ایک ہی مقالے میں جشن فردوسی کے دو نام الگ الگ بتائے ہیں۔
۱۹۲۴ء سے [illegible] ایک مقالہ [illegible] ۱۹۲۲ء [illegible]
کیا ہو مقالہ ترجمان حقیقت، فارسی شاعر [illegible] اقبال [illegible]

لہ مقالہ مترجمہ [illegible] صفحہ

ایسی خصوصیت بھی نہیں جو دوسروں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر سکے"[1]

اس کے برعکس مغرب کے دانشور اقبال کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ای۔ ایم فارسٹر ایسا ناقد اور نادر تبصرہ ۱۹۲۰ء میں علامہ اقبال اور ٹیگور کا موازنہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

"یہ بھی ہمارے شہنشاہانہ طرزِ حکومت کا ایک کرشمہ ہے کہ اقبال جیسے شاعر کے کلام کا ترجمہ جس کا نام گزشتہ دس برس سے اس کے ہم وطن مسلمانانِ ہند میں بچے بچے کی زبان پر ہے اسقدر عرصہ بعد جا کر ہماری زبان میں ہو سکے ہندوؤں میں جو مرتبہ ٹیگور کو حاصل ہے وہی مسلمانوں میں اقبال کو ہے اور زیادہ صحیح طور پر ہے اس لئے کہ ٹیگور کو بنگال کے باہر اس وقت تک کسی نے نہ پوچھا جب تک وہ یورپ جا کر نوبل پرائز نہ حاصل کر لائے۔ برخلاف اس کے اقبال کی شہرت و ناموری یورپ کی اعانت سے بالکل مستغنی ہے"[2]

اب تک جشنِ فردوسی کے حوالوں سے جو کچھ لکھا گیا تو اس سے نہ صرف یہ امر واضح ہوتا تھا کہ ایران میں علامہ اقبال کی وہ پذیرائی نہ ہو سکی جو فارسی کلام کی بنا پر ان کا حق تھی لیکن دیر آید درست آید کے مصداق ایک مرتبہ جب اہلِ ایران نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کر لیا تھا تو پھر وہ اس کے سحر سے آزاد نہ ہو سکے اور آج تو ایران میں اقبال کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تہران کے

---

[1] مطبوعہ ماہِ نو، کراچی اقبال نمبر اپریل ۱۹۷۰ء

[2] ای۔ ایم فارسٹر کا یہ تبصرہ رسالہ "التھینیم" میں چھپا تھا اس کا اردو ترجمہ از سید سلیمان ندوی "کلامِ اقبال جبلِ ہندوستان" کے عنوان سے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ، جون ۱۹۲۰ء میں طبع ہوا۔ یہ مضمون ایک قیمتی کتاب "اقبال بحیثیت عالم" میں بھی شامل ہے۔

مشہور علمی مرکز [illegible] ارشاد کی مسجد کی چھت پر علامہ اقبال کے اشعار لکھے ہوئے ہیں جبکہ [illegible] مشہور [illegible] دانشور ڈاکٹر علی شریعتی نے علامہ کو [illegible] قرار دیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی [illegible] کے باعث لیڈر [illegible] بہت [illegible] رکھتے تھے شہنشاہ کے خلاف جدوجہد میں انہیں [illegible] سے [illegible] تھے) اپنے پیغام، حرکت و عمل کی بنا پر علامہ اقبال ایران [illegible] بہت مقبول ہیں۔ چنانچہ ایران سے آنے والوں نے بتایا کہ وہ جوانوں کے کئی [illegible] کے ساتھ علامہ اقبال اور [illegible] الدین افغانی کی تصاویر بھی [illegible] ہیں۔ [illegible] شاعر محمد [illegible] جب لندن میں بیٹھ کر اپنے مجموعہ [illegible] کے [illegible] تقسیم کرتا ہے تو اسے معنوی اقبال کے نام کرتا ہے [illegible] علامہ اقبال کے [illegible] تخلیقی زندگی کی پرگ [illegible] نقوش ثبت کئے ہیں۔ [illegible] فکر کی [illegible] سے کہ سعی و عمل کی گرمی [illegible] علامہ کے اشعار [illegible] ثابت ہوئے۔

(۲)

علامہ [illegible] کا [illegible] سے [illegible] جس [illegible] ہوتے [illegible] ہیں [illegible] ایران سے علامہ کی [illegible] محبت [illegible] سے [illegible]

"زبور عجم" میں علامہ نے ایک غزل میں ایران کی نوجوان نسل سے جس محبت کا اظہار کیا ہے وہ ایک ایک شعر سے [illegible] ہے۔ اس لئے یہ اب حوالے کی چیز بن چکی ہے۔ اس معروف غزل سے چند شعر پیش ہیں:

چوں چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
ای جوانان عجم جان من و جان شما

خوطہ ہا زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکار پنہان شما
چہرہ ماہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت
ریختم طرح حرم در کافرستان شما!
تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش
شعلہ آشفتہ بود اندر بیابان شما
فکر رنگینم کند نذر تہی دستان شوق
پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشان شما

حلقۂ گردن من زینۂ پیکران تب و تاب
آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

آفرینش ز جہان محبت کشمیر
دل از حریم حجاز و خرد نشیمن است
عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدائے من درائے کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

اس گہری محبت کے نتیجے میں جب علامہ اقبال نے فارسی میں شاعری شروع کی تو ہندوستان کی دیگر اہم زبانوں کے مقابلے میں جس کی مستحق تھی وہ جانتے تھے کہ میر تک کچھ ہے جسے عبدالقادر کی مشک کچھ درست کرنے کے لئے اسرارِ خودی کی تمہید میں لکھتے ہیں:

نے عراقی نے رہینِ مثنوی مقصود نیست — بت پرستی بت گری مقصود نیست

ہندیم از پارسی بیگانہ ام — ماہ نو باشم کہ پیمانہ ام

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

فکرِ من از جلوہ ہا سرشار گشت — خامہ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام

درخورِ با فطرتِ اندیشہ ام

یہ اشعار کسرِ نفسی کے طور پر ہی سہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی شعر و ادب کی زبان و اسلوب کی بنا پر ہی ایرانیوں نے علامہ اقبال کے کلام کی طرف خصوصی توجہ نہ دی جو توجہ جو ان کا حق بنتی تھی۔

اس ضمن میں ایک بنیادی وجہ تو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے بارے میں خود ان کا معروف رویہ ہے جس کی طرف وقتاً فوقتاً ناقدین نے اشارے بھی کئے ہیں یعنی سوائے امیر خسرو کے وہ اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔

یہاں میں مختلف شعری دبستانوں یا مذاہب کے بہت سے [illegible]

[illegible]

ہوتی ہے چنانچہ شاعری کے تین ادوار یا سبک یعنی سبک خراسانی، سبک عراقی، سبک
ہندی، برصغیر میں سبک ہندی اس وقت بھی جاری رہا جبکہ ایران میں اس کے خلاف رد عمل شروع
ہو چکا تھا جسے بازگشت ادبی کہتے ہیں۔ اس لئے اہل ایران سے یہاں کی فارسی اور فارسی گوئی کو
کبھی بھی دخور اعتنا نہ جانا علامہ اقبال کو ان دونوں امور کا احساس تھا اس لئے انہوں نے خود کو
متروک سبک ہندی کی لسانی روایت سے الگ رکھ کر اپنے لئے ایک نیا شعری اسلوب منتخب کیا۔
اس لئے جب وہ یہ کہتے ہیں۔

حسن ندا زبیان از من مجو　　خود اسارد صنبان از من مجو

تو در اصل رومی شاعرانہ کسر نفسی سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے لسانی موقف کی وضاحت کرتے
ہیں اور وہ موقف یہ ہے طرز گفتار دری شیریں تر است

علامہ اقبال ایران کے کلاسیکی شعراء اور بالخصوص رومی سے بے حد متاثر تھے چنانچہ انہوں
نے ان کے اشعار کی تضمین کی، اور بعض تراکیب کے استعمال سے ان کی عظمت کو خراج تحسین پیش
کیا اور اپنے اشعار میں بھی کھل کر ان کی توصیف کی۔

مطرب غزلے بیتے از مرشد روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے
ملک عجم از ہنر مصرع نظیری را
کے کشتہ نہ شد از قبیلہ نیست

عطا کن شور رومی، سوز خسرو　　صفا کن صدق و اخلاص شافی
بہ شعر عراقی را بخوانم　　کہ جامی زندہ از آتش بجاز

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!
وقت برہنہ گفتن ست من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را

(۳)

گزشتہ برس اقبال شناسی کی روایت کا آغاز ہوا۔ پہلی نشست میں معاصر کیا جانے والا روایت ایک
پرانی، استاد سید محمد علی دلگیر، سلسلہ کو حاصل ہوئی۔ یہ جامعہ عثمانیہ، دکن، میں شعبۂ فارسی کے ڈین
و صدر تھے۔ انہوں نے یہاں اہل قلعہ پر لیکچرز کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اسی ضمن میں انہوں
نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر بھی ایک لیکچر دیا۔ جسے بعد میں اقبال و شعرِ فارسی کے نام سے
ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع بھی کر دیا گیا۔ یہ ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔

پمفلٹ کی صورت میں یہ مقالہ فارسی زبان میں علامہ اقبال پر وہی تحریر ہے جو سید محمد
عباس علوی اور دیگر پرانے اقبال شناسوں نے اس ضمن میں دی۔ سلسلہ کی روایت کو سمیٹ کر ہے۔

یہاں کے مقابلے میں علامہ اقبال افغانستان میں زیادہ جانے پہچانے ہو چکے تھے۔ جغرافیائی
قربت کے علاوہ ایک وجہ علامہ کا دورۂ افغانستان بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ اس دوران میں افغانستان
کے اہل علم اور دانشوروں اور شعرا نے کثیر تعداد میں علامہ سے ملاقات کی۔ چنانچہ افغانستان میں علامہ
کی تصانیف بھی مل جاتی تھیں۔ اس رہنمائی میں افغانستان کے ایک شاعر و دانشور کو پانے علامہ سے تلمذ
کا شرف قبول کیا۔ چنانچہ انہی کی زبان سے سید محمد عباس علوی نے اقبال شناسی کی روایت کو آگے بڑھایا۔

پمفلٹ دو تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ خوش [illegible]

عرصے تک علامہ اقبال کو افغانستان کا شاعر سمجھا جاتا رہا۔ افغانستان میں جو چند ادبی مجلات تھے (جن میں "کابل" سرفہرست ہے) ان میں علامہ اقبال کا کلام چھپتا رہا۔ شاید اس لیے ۱۹۳۸ء میں علامہ کے انتقال کی خبر کے ساتھ ان کا جو ایک فارسی قطعہ شائع ہوا، وہ مجلہ "کابل" سے لیا گیا تھا۔

۱۹۴۴ء میں ایران اور ہندوستان کے ادبی اور ثقافتی روابط کے فروغ کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی۔ اس انجمن نے ۱۹۴۴ء میں پہلا یوم اقبال منایا اور اگلے سال سید محیط طباطبائی نے اپنے مجلہ "محیط" کا "اقبال نمبر" شائع کیا — اور یوں ایران میں اقبال شناسی کی روایت کی بنیاد استوار ہو گئی ایسی روایت جس کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا، خاص طور سے قیام پاکستان کے بعد سے۔ چنانچہ سید محیط طباطبائی، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی، ڈاکٹر محمد علی رجائی، ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی، ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب، سید غلام رضا سعیدی، ڈاکٹر حسین خطیبی، بدیع الزمان فروزانفر، ڈاکٹر علی شریعتی، ڈاکٹر ناظر زادہ کرمانی، ڈاکٹر جلال متینی، ڈاکٹر فریدون بدرہ ای، ڈاکٹر محمد تقی مقتدری، احمد، احمدی بیرجندی۔ یہ محض چند نام نہیں، بلکہ اقبال شناسی میں منفرد زاویوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ منظوم صورت میں علامہ کو خراج عقیدت پیش کرنے والے شعرا کا تو بلاشبہ شمار ممکن نہیں کہ بیشتر ایرانی شعرا نے کسی نہ کسی انداز میں علامہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور بحیثیت مجموعی ڈاکٹر محمد علی رجائی کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ "میرے خیال میں اقبال ایک نو دریافت براعظم کی مانند ہیں جس میں کتنی ہی دل آویز اور قابل غور چیزیں ہنوز بحث طلب ہیں۔"[۱]

---

[۱] : مقالہ کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی مرتبہ "اقبال مدیح عالم"۔

ایک فرانسیسی اقبال شناس

سرِ خودی ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی تو پروفیسر نکلسن اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کے ترجمہ کی اجازت طلب کی اور یوں ۱۹۲۰ء میں جب پروفیسر نکلسن کے مقدمہ کے ساتھ سرِ خودی کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو فکرِ اقبال سے مغرب کا اولین تعارف ہوا۔ مغربی دانشوروں نے اس پر تبصرے کئے، جن میں اقبال کی بنا پر اسی یکتا رسالہ ورلڈ ریویو کے مضامین بے خصوصی اہمیت اختیار کر گئے۔ پھر نکلسن اور اس کے بعد دیگر مترجمین کی کاوشوں سے مغرب میں اقبال شناسی کی روایت کا آغاز ہوا۔ ان ترجمہ کے ذریعے یورپ کی بعض دیگر زبانوں جیسے جرمنی، فرانسیسی اور جرمن کے دانشوروں نے اقبال کی طرف توجہ کی۔ اور یوں علامہ اقبال کے انتقال کی پہلی صدی کے آغاز میں مغربی ممالک میں فکرِ اقبال کی گونج سنائی دینے لگی۔

قیامِ پاکستان کے بعد علامہ اقبال سے کسی ایک شاعر یا مفکر پر شعورِ پاکستان کی بنا پر قومی سطح اور اس سے بھی بڑھ کر پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ تمام ممالک کے شاعر ہونے کے باعث علامہ اقبال کی شاعری کا ممالک غیر میں بھی بطور خاص مطالعہ کیا گیا۔ دوسرے دنیا کے بیشتر ممالک میں اردو زبان سے واقفیت ہونے کی وجہ سے بھی مطالعہ اقبال میں مدد معاون ثابت ہوئی ہیں۔ چونکہ گزشتہ تیس برسوں میں علامہ اقبال قومی سطح سے بین الاقوامی اہمیت اختیار کر گئے اور دسمبر ۱۹۷۷ء میں

[illegible]

[illegible]

خصوصی نام پیدا کیا ان میں سے بہ نسبتاً زیادہ معروف ہیں ایل گورڈن پونسکایا، ماریا ستے جینتس
گولانی نی کیف، یوری گیشکو فسکی۔ جبکہ عبداللہ غفور رؤف، اور میر سعید قادر مہر شاکر اتاکستان،
میر جانوف اور ایس ملیرا ٹیف از بکستان نے روسی کے علاوہ اپنی اپنی زبانوں میں اقبال
کے اشعار کے تراجم کئے اور فکر کی تشریح میں مقالات قلم بند کئے۔

ان کے علاوہ چیکوسلوکیہ میں بال مارکیک سوئیڈن میں کارل سوینگ اور رومانیہ میں
آیون ہاڈیان پوپ نے اقبال کی منتخب منظومات کے ترجمے کئے ہیں کینیڈا میں ڈاکٹر نیل میکڈونلڈ
اور امریکہ میں ڈاکٹر گیرہارڈ ہنزرخ بورنگ، ڈاکٹر باہرا مکاف وغیرہ نے اقبال کی شاعری کے
مختلف پہلوؤں پر مقالات قلم بند کئے ہیں

جب مغرب میں اقبال شناسی کے اس وسیع تناظر میں فرانسیسی دانشوروں کی اقبال
شناسی کا جائزہ لیا جائے تو وہ کسی سے بھی کم عیار نہیں ثابت ہوتے ان کی اقبال
شناسی کی روایت میں سب سے پہلے ایوا میریچ کو ہی مقام حاصل ہے جو انگریزی میں پروفیسر نکلسن
کا ہمعصر تھا اور اس نے سب سے پہلے علامہ کی کتاب کا ترجمہ کیا اس ضمن میں یہ امر بھی قابل
ذکر ہے کہ ایوا نے ترجمہ کے لئے شاعری کو منتخب نہ کیا جس میں عام قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان
نہیں ہوتا ہے بلکہ علامہ کی اس کتاب کا ترجمہ کیا جسے کثرت سے قارئین پڑھتے ہیں کیونکہ اس نے
تشریح دیا ہے میری مراد تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ہے جس کا ترجمہ اردو میں ڈاکٹر نذیر
ترجمہ نہ ہو سکا۔ ماہ اگست ۱۹۵۵ء میں پیرس سے اس کا ترجمہ شائع کیا اور ان کا اپنا
بیان ہے کہ اقبال کو پڑھ کر میں اتنی متاثر ہوئی کہ اسلام قبول کر لیا اس ترجمہ کے بعد
پیریا ریوپ نے محمد یکن کے ساتھ مل کر پیام مشرق کا ترجمہ طبع کیا ۱۹۶۲ء میں ایوا مار
ریوپ نے ڈاکٹر محمد مقیم کے اشتراک سے جاوید نامہ کا ترجمہ پیرس سے شائع کیا یوں دیکھیں

[illegible] مادام ایوا [illegible] فرانس کی سب سے بہترین [illegible] ہیں

چھ سال مادام [illegible] نے [illegible] بعد الہیات اسلامیہ کا ترجمہ شائع کیا اسی برس یعنی ۱۹۵۰ء میں [illegible] سے [illegible] اب تک [illegible] مصنف [illegible] ڈاکٹر محمود نے [illegible] صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ [illegible] میں شائع کیا تھا

آخر [illegible] یہ مختصر کتاب [illegible] کا [illegible] نے [illegible] مندرجات پر [illegible] علامہ اقبال کے فلسفیانہ [illegible] سے [illegible] دلچسپی [illegible] ہے [illegible] فرانس [illegible] فلسفہ اقبال [illegible] مذہب اقبال [illegible] جن پر [illegible]

علامہ اقبال کے [illegible] میں

یورپ میں بہت روشنی علم و [illegible] ہے

[illegible] علامہ [illegible] روشنی سے [illegible] کے بارے میں [illegible] کا تعصب [illegible]

وابستہ تمام امور کو یک طرفہ سے عینک جنگوں کی صورت دے دیتے ہیں مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جتنی بے شمار غلطیوں اور کج فکری کا اصل ماخذ ایسے ہی مغربی دانشوروں کے اقوال و آراء میں تلاش کیا جا سکتا ہے علامہ اقبال کی شاعری میں اسلام اور حضرت محمد سے جس والہانہ عقیدت اور شیفتگی کا اظہار ملتا ہے وہ آفتاب سے کہ اسے بطور نام اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کے تناظر کے بغیر علامہ کے فلسفہ (بلکہ ذکر اس کے سماجی پہلوؤں اور انسانی روابط سے متعلق حصوں) کی درست تفہیم ممکن نہیں کہ اس تناظر کے بغیر فکری مغالطوں میں الجھ کر غلط نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں جو سامان ذخیرہ شعوری کاوش اور فکری استعداد کے بغیر بھی میکانکی انداز میں علامہ کی شاعری کو اس تناظر میں رکھ کر سمجھ سکتے ہیں لیکن علامہ مغربی دانشوروں کے لئے یہ ممکن نہیں اسی لئے چند مستشرقین کی اتنی ہی مثالوں سے قطع نظر اچھے خاصے اور روشن خیال فرد کی اکثریت بھی اسلام سے آگہی نہیں رکھتی تو اس کی روشنی میں فکر اقبال کی اساس دریافت کر کے اس کی اہمیت کا تعین کر سکے اس کا اولین مظاہرہ "اسرار خودی" کے انگریزی ترجمہ کے اولین مبصر پروفیسر ڈکسن کے مخالفانہ رویہ ہی سے ہو جاتا ہے جس کی وضاحت میں خود علامہ کو ایک طویل مکتوب تحریر کرنا پڑا تھا[1]

آج ہمیں پروفیسر ڈکنسن یا اسی انداز کے دیگر ناقدین کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ بیشتر مغربی دانشوروں کا اسلام اور اس سے وابستہ دیگر موضوعات کے بارے میں معاندانہ رویہ نہیں ہے ہر چند کی اب وہ صورت حال نہیں ہے اور دنیا کے بیشتر روشن خیال مستشرقین یا اقبال شناسوں کی کمی نہیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں دونوں کے بارے میں روشن طبعی کا ثبوت دیا ہے ایسے ہی روشن خیال دانشوروں

---

[1] یہ خط "انگریزی جریدہ" میں طبع ہوا تھا اس کا اردو ترجمہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف ستمبر ۱۹۲۱ء

ئیب وس کلوڈ ٹینچ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جس نے فرانسیسی زبان میں سب سے پہلے علامہ اقبال کے فکر و فن پر کتاب لکھی ہے

فکرِ اقبال کا تعارف خصوصاً کے باوجود نہ صرف یہ کہ فکرِ اقبال کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اس کی کوشش کی ہے کہ فکرِ اقبال کو اس کے درست تناظر میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ اس امر پر بھی اقبال کی کلیت کو مدنظر رکھنے کی کوشش ہے چنانچہ وس کلوڈ کے مطابق یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور وہ قرآن مجید سے نفرت کرے؟ ہند یہ کہا جا سکتا ہے کہ فکرِ اقبال قرآن مجید سے ہمدرد ہے اور نہیں تو کم از کم اس کے فکر کی وسیع حدود کے تحت یہ بالکل درست ہے۔ شاعرِ اقبال تو متعدد بار قرآن مجید سے استفادہ کرتا ہے چنانچہ اس کے ہاں آیات کے جو بار بار حوالے ملتے ہیں تو اس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال کا مطمحِ نظر پیغمبرِ خدا کی تعلیمات کو صراطِ مستقیم سے انحراف نہیں پاتے۔

وس کلوڈ نے اقبال کو اسلام کے حوالے سے سمجھنے پر جس طرح زور دیا وہ اس کے مخصوص مذہب ناشناس فکری رویوں کے مقابلہ میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

کر جاتا ہے مغرب میں سیکولر میلانات کی بنا پر مذہب اور یہ صرف اسلام ہی کے لئے نہیں بلکہ خود ان کی مسیحیت بھی اس میں آجاتی ہے اور اس پر استوار ہر نوع کی فکر بالعموم ان کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں عیسائیت میں فکری رہنمائی کی صلاحیت کبھی بھی نہ تھی باقی رہا وہ تھوڑا بہت تعلق جو عقائد کی صورت میں ہو سکتا تھا تو سائنسی انکشافات نے انہیں اوہام ثابت کر دیا اسی لئے تو مغرب میں اب پیدائش کا متروک ہونا مذہب بلکہ تمام مذاہب کی تنسیخ کے مترادف قرار پایا۔

ایسے میں بوسس کلوڈ کا یہ کتاب بیحد معنی خیز ہو جاتا ہے:

"اس عظیم مفکر پر قرآن مجید کے اثرات کو یوں ہی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ہم مشرقی خواہ عمل مذہب سے کتنے ہی نابلد کیوں نہ ہوں لیکن مذہب کے بارے میں ہمارا جذباتی رویہ بیحد شدید ہوتا ہے ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل انتہا پسندانہ ہے کہ اس کے نتیجے میں اگر ایک طرف مذہب روزمرہ کی زندگی سے خارج ہو جاتا ہے تو دوسرا ان غیر منطقی رویوں کو جنم دیتا ہے جو آج ساری دنیا میں مذہبی نہیں ہو سکتے اقبال کے ضمن میں بھی یہی جذباتیت کارفرما نظر آتی ہے اقبال کی زندگی میں مذہبی طبقے نے سب سے زیادہ ان پر تنقید کی حتیٰ کہ تکفیر کا فتویٰ بھی لگایا گیا جبکہ قیام پاکستان کے بعد مذہب کا نام لے کر ان پر ہر نوع کی صحت مندانہ تنقید کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں اس حد تک کہ اوریجنل سوچ رکھنے والے اقبال پر کوئی نئی بات کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

بوسس کلوڈ نے فکر اقبال میں اسلام کی اہمیت کو تو تسلیم کیا لیکن اس نے رومی کی انسانی مثال سے قطع نظر اقبال پر دیگر مسلم دانشوروں کے فکری اثرات کو نہ تسلیم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہمارے اقبال شناسوں کو اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ ان دنوں یہ کچھ فیشن سا بن چکا ہے کہ جس کسی نے شوشہ چھوڑا تب سے ہمارے ہاں نظر آیا تو اس کے حامیوں کو صف پر ایک جامع مضمون قلم بند کر کے فکر اقبال میں اس کا مقام متعین کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جبکہ لوس کلوڈ کے الفاظ میں:

"ترقی اسلام سے ہم فکر اقبال نے مسلم مفکرین سے رہنمائی حاصل کی ہے جبکہ حلقہ اسلام میں صرف قرآن مجید کی تعلیمات اور ترقی کے تصورات نے ہی سب سے خاص متاثر کیا ہے"

اور فرنچ مبصر سے تصور فکر اقبال کے ساتھ تصورات کو موازنہ کرنے کی حقیقت بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔

[illegible]

قرار پا چکا ہے لطیفہ یہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں صاحب مقالہ نے خود ان فلاسفروں کا تفصیلی ذکر اتنا مناسب نہیں کیا ہوتا کہ ان کے فکری رویوں اور اقبال کے تصورات کی ہر جہت کے نکات ان کرنے کی ہیت رکھتے ہوں جس کے نتیجہ میں دوسروں کے مقالات سے حوالے جمع کر کے اپنے مقالات کو سجایا جاتا ہے مقصد اپنی علمیت کا رعب ڈالنا ہوتا ہے لیکن یوں سب کے رعب ڈالنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر مقالہ نگار آخر میں چند کرکے ہتھیار ڈال کے یوں نام گنوا دیتا ہے کہ یہ اقبال ان سب سے متاثر تھا لیکن اس کا ذکر اردو میں ہمارے اقبال شناسوں کی اکثریت کے برعکس ہے۔ اس کے بقول:

> بعض ناقدین نے اقبال پر نطشے کے فلسفیانہ اثرات کے بارے میں غلو سے کام لیا ہے اس حد تک گویا اقبال اس کا ایک ادنیٰ شاگرد ہو لیکن یہ انداز نظر غلط ہے اور کوتاہ بینی پر مبنی!

اس سے زیادہ واضح اور دو ٹوک الفاظ میں اقبال پر نطشے کے اثرات کی نفی ممکن نہ تھی اس ضمن میں ہربرٹ ریڈ کے ایک مقالہ کا بھی ذکر بے محل نہ ہوگا جس نے ۹۲ء میں اقبال پر نطشے کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے اقبال کو نطشے پر فوقیت دیتے ہوئے یہ لکھا تھا۔

> نطشے اور وہٹ مین کے مقابلے میں اقبال نے صداقت کا زیادہ یقینی طور پر احساس کیا ہے وہٹ مین کا "ربانی اوسط" خاصہ مبہم ہے اور بطور ایک تصور اس میں تو نائی کی شدت کا فقدان نظر آتا ہے جبکہ نطشے کا مافوق البشر سماج کا باغی ہے لہٰذا جبلتی طور پر ہمارے لئے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اقبال کا مرد کامل تو خود ہی ربانی اوسط ہے دوستو اس کا "ربانی اوسط"

اوسند ہی مرزا ہاں ہے۔ وہ مسلم بھی ہے اور مسلم پرست بھی۔

اس کلوڈ نے اقبال کو یونانی فلسفے کے تراث سے آزاد کرتے ہوئے کہا کہ یونانی تصورات نے مغربی تہذیب پر گہرے اثرات ہی نہ ڈالے بلکہ یہ اثرات خود اسلام تک بھی پہنچے ہیں کہ تاریخ کی اسوریت یونانی فلسفے کو مقدس جانتے تھے اور انہوں نے کئی مواقع پر اس کا پرچار ... اپنے مزاج کے ساتھ اسلامی تہذیب یونانی ثقافت سے تشکیل ہوئی ہے مگر اس حوالے سے فلسفے کے ضمن میں وہ رقمطراز ہے:

جرمنی کے عقلی مفکروں سے بھی فکر انسانی پر بہت پہلے اثرات ڈالے ہیں یہ وہ صاحب کائنات کے ساتھ تصور کی دنیا تک قدم ملا سکتے ہیں جدید دنیا کے راستہ تبدیل کر دیتے ہیں۔

اس کلوڈ نے ہمارے ... کے ... کے ... کے ... بنیادی پہلوؤں کو بطور خاص اجاگر بھی کیا۔

نظریات پر مغربی مفکرین کے تراث کے ضمن میں اس کلوڈ نے توجہ دلائی ہے ان تمام نظریات کا تشکیل ہوں جبکہ انسان پرستوں کی تخلیقی عقول ... ہیں جو مغربی مفکرین کے ... کے بغیر اقبال پر مقالہ مکمل نہیں کر سکتے۔ اس کلوڈ نے

اقبال نے مغربی فکر سے بہت ماسی اخذ کیا ہے بعض اوقات وہ اس کے قریب تھا بھی ہے مگر جب وہ اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے اقبال ... کے تکمیل کی کڑی کی خدمت کے جس عمل کو اپنایا تھا اقبال سے بڑھ کر اس پر اور کون عمل پیرا ہو سکتا تھا؟

اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت

اسرارِ خودی پہلی بار لاہور سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی مجھے فوراً ہی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اقبال سے جن سے ملاقات کا شرف کیمبرج میں حاصل کر چکا تھا اجازت چاہی کہ میں اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر سکوں میری درخواست بخوشی قبول کر لی گئی ....."

ڈاکٹر نکلسن نے اسرارِ خودی کے ترجمہ (۱۹۲۰ء) کی اشاعت کے موقع پر جو دیباچہ قلم بند کیا اس کا آغاز ان سطروں سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کو مستشرقین میں جو اہم مقام حاصل تھا اس کی وجہ سے اسرارِ خودی کا ترجمہ چھپتے ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور اس پر مخالفانہ اور موافقانہ تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر ڈکنسن، ای ایم فارسٹر اور سر برٹ ریڈ کے مقالات کا تذکرہ اس کتاب کے ایک اور مقالہ "اقبال مدوحِ عالم" میں کیا جا چکا ہے۔

مغرب سے اقبال کا اولین تعارف اسرارِ خودی سے ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے نکلسن کے اس ترجمہ کی اہمیت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا کہ ہر ناقد نے اس ترجمہ پر انحصار کیا اس کے بعد پروفیسر آربری کا نام آتا ہے جنہوں نے جاوید نامہ

۱۹۲۲ء، رموزِ بیخودی اور زبورِ عجم ۱۹۳۸ء کے علاوہ شعر و ادب، اور خاص طور سے تراجم کے علاوہ پیرِ مشرق کی بیاضات کے نسخے بھی ہیں۔ انہوں نے اقبال پر جو کتابیں پیتار کی بیئت سے لکھا چنانچہ جاوید نامہ کے دو حصے اقبال پر تحقیقی نوعیت کے مضامین کا روایتی تعلیق دیتے ہیں کے ساتھ ساتھ ایسی گرم جوشی اور محبت سے کام لیا ہے۔

اقبال کے پیرِ مغاں کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جب اقبال کے تراجم کی طرف توجہ دی گئی تو انہوں نے ایک نظم بھی لکھی جس میں پیرِ مغاں کی نظم حسنِ بھی ان کی یادگار ہے لیکن حیاتِ اقبال میں اقبال کے نشوونما سے اقبال کے افکار و تصورات کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی جس کی وجہ تراجم بنتے ہیں ۱۹۵۲ء میں جب شعور کی لہر [illegible] جاوید نامہ کا ترجمہ شائع ہوا اقبال کے نشوونما اقبال شناسی کا روایت کا آغاز ہوا۔ برزالی نے اقبال کے فلسفہ افکار کی تشریح و توضیح میں کئی مقالات بھی قلم بند کئے ہیں۔ اب تک دو پیامِ مشرق بانگِ درا، زبورِ عجم، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور رموزِ بیخودی کے منتخب منظومات کے علاوہ تراجم طبع کرا چکے ہیں لوپا کیسے برزالی نے ہی اتنا کام کر لیا کہ اب اقبال کا [illegible] شخص کر کے اقبال کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکتا ہے۔ مغربی دنیا کی نامور مستشرق [illegible] میری شمل کو مشرقی زبانوں سے اور تصوف سے جو والہانہ شغف ہے اسے دیکھتے ہوئے کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ موصوفہ پیدائشی مسلمان ہیں اور [illegible] نہیں [illegible] مغربی فارسی ترکی اور اردو کے ساتھ ساتھ پاکستان کی [illegible] زبانوں پشتو، سندھی، پنجابی [illegible] کا درجہ رکھتی ہیں [illegible] تاریخ [illegible]

مستشرق ہو جو ایک ہی سانس میں اقبال، رومی، حافظ، بیدل، سرمست اور سلطان باہو کا نام لے سکتا ہو۔ اسلامی ادبیات اور تصوف کے ساتھ ساتھ اقبال کو مغربی دنیا سے روشناس کرانے میں تنہا ڈاکٹر شمل نے جو کردار ادا کیا وہ تعداد اور معیار کے لحاظ سے بڑے بڑے علمی اداروں پر بھاری ہے۔ ڈاکٹر شمل وہ واحد مستشرق ہیں جنہوں نے یورپین ہوتے ہوئے جاوید نامہ کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا اسی طرح جاوید نامہ کے کچھ حصے اور مسجد قرطبہ وغیرہ کے منظوم جرمن تراجم بھی قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ اردو ادبیات کی تاریخ پر بھی انہوں نے ایک بلند پایہ کتاب تحریر کی ہے۔

'CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINING TO IQBAL -"

یہ کتاب ۱۹۷۵ء میں طبع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شمل کو اقبال سے جو گہری عقیدت ہے اس کا اظہار محض تراجم سے ہی نہیں ہوتا بلکہ انہوں نے فکر اقبال کی تشریح و توضیح پر جو اسقدر مقالات قلم بند کئے ان میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے چنانچہ ۱۹۷۵ء میں پاکستان پر جرمن مطبوعات کی کتابیات میں مندرج مقالات میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) فکر اقبال میں شیطان کی حقیقت (۲) اقبال اور جرمن ادبیات (۳) اقبال اور سلوک (۴) اقبال ممالک خارجہ میں (۵) فکر اقبال پر مغرب کا اثر (۶) جاوید نامہ تاریخ ادیان کی روشنی میں (۷) فکر اقبال میں پیغمبر اسلام کا مقام (۸) اقبال کا نظریہ توحید (۹) اقبال کا تصور وجود (۱۰) زمان و ابدیت کا مسئلہ۔

یہ تعجب خیز سہی مگر یہ حقیقت ہے کہ مغربی دنیا سے کہیں بہت پہلے روس میں

اقبال کا نام لیا جا چکا تھا پہلا روسی محقق جس نے اقبال کی طرف توجہ کی [illegible]
کرتی تھا۔ جس کی کتاب ایران کی تاریخ و ادب ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی [illegible] کتاب
میں رعنی نے اس مقالے کا حوالہ دیا ہے جس کی بنا پر علامہ نوبیتن [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی ڈگری [illegible] مقالہ کا موضوع [illegible] اقبال [illegible]
تھا کہ [illegible] کے بعد اس مقالے کا مصنف [illegible] یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی [illegible]
اسد [illegible] اور یورپ سے تعبیر یافتہ ایک مسلمان ہے جس نے تصوف کے موضوع پر [illegible]
[illegible] سے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن یہ دیکھنا [illegible] ہے کہ اقبال [illegible]
کی مذہب [illegible] ہیں نہ [illegible] جا سکتی اس کی وجہ وہاں کے سیاسی حالات [illegible]
[illegible] سے [illegible] کے بعد کے حالات اور بالخصوص [illegible]
[illegible] اقبال [illegible] سے [illegible]
[illegible] مذہب [illegible] کتاب [illegible] کا ترجمہ [illegible] مشہور [illegible] شعر [illegible]
[illegible] تحریک [illegible] پر [illegible] کی کتاب [illegible]
فکر اقبال [illegible] پر [illegible] جس کی [illegible] جبکہ [illegible]
شتابیاریگا دینا نے اقبال کے اسلوب کا لسانی تجزیہ پیش کیا تھا۔ تراجم اور تنقیدی مو[illegible]

کے لحاظ سے یہ کتاب خاصے کی چیز ہے۔ اقبال پر ہی کا ربط [illegible] وقت روں میں [illegible]
اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں ۱۹۷۲ء میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کی شاعری کے موضوع پر
تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی یہ کتاب اب دوسری بار چھپ چکی
ہے اور اقبال پر حوالہ کی چیز بن چکی ہے اس میں اسرار خودی، بانگ درا اور پیام مشرق
کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے حال ہی میں مطالعہ اقبال کے نام سے ان کی نئی کتاب
طبع ہوئی ہے اقبال کی رسمی تاریخ پیدائش کا سب سے پہلے بوقی ڈیناسے ایک
چیک سکالر ڈاکٹر جان میرک (۱۹۵۸ء) کے حوالے سے ذکر کیا تھا یہ ۹۵۸ء کی بات
ہے جبکہ اس کے کہیں بیس برس بعد ہمارے ہاں [illegible] تاریخ کا تعین کیا جا سکا۔ یہ
[illegible] کے ساتھ ساتھ ایک اور خاتون ایم ڈی سے [illegible] نے بھی اقبال پر قابل ذکر کام
کیا ہے [illegible] کی [illegible] خضر علی، عبداللہ [illegible] کی [illegible]
ایک [illegible] نے بھی اقبال کے افکار و فن پر کر [illegible] تحریر کی ہیں۔

[illegible] کے بعد جب مشرقی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] کرنے کی ضرورت نہ ہوتی جو [illegible] اقبال نے [illegible] اس [illegible]
[illegible] کہ [illegible] کی [illegible] اقبال
[illegible] پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اقبال [illegible] کس [illegible] کامیاب
رہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایران میں اقبال کسی بھی شاعر یا فلسفی سے
مقبول ہیں، ناقدین نے ان کے افکار و فن پر گرانقدر مقالات لکھے تو عظیم [illegible] نے اقبال

[illegible] عقیدت پیش [illegible] شعر کے نام لٹریچر خاص [illegible]
صادق [illegible] ملک [illegible] آقائے سید نفیس [illegible] آقائے [illegible]
[illegible] آقائے [illegible] آقائے [illegible] آقائے [illegible]
آقائے ادیب [illegible] آقائے عباس [illegible] [illegible]

ایک زمانہ تھا جب بعض اہل زبان نے اقبال کی فارسی پر اعتراضات کئے تھے [illegible]
[illegible] اقبال [illegible] ۱
[illegible] تک [illegible]

اقبال [illegible]
[illegible] اور [illegible] اقبال [illegible]
[illegible] زبان [illegible]

[illegible] اقبال نے جدید دور کی فارسی شاعری میں ایک نئے اسلوب بیان کی بنیاد
رکھی [illegible] اسلوب بیان [illegible]
[illegible] چاہیئے اور آج کے ادبا [illegible] کو اقبال کے نام سے [illegible]
[illegible] زبان [illegible]
[illegible] علامہ [illegible]
[illegible] عبدالوہاب [illegible] اقبال سے [illegible]
[illegible] ۱۹۲۲ء میں [illegible]
[illegible]
[illegible] اقبال [illegible]
[illegible] ۱۹۵۸ء [illegible] اقبال [illegible]

اب تک پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کی منتخب نظموں کے علاوہ ارمغانِ حجاز کی فارسی نظموں کے تراجم کر چکے ہیں۔ "ضربِ کلیم" کا بھی ترکی ترجمہ شائع کر چکے ہیں ان تراجم کے علاوہ ڈاکٹر تارلان نے اقبال کے افکار و تصورات کی تشریح میں بعض اہم مقالات بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان نے ترکی زبان میں "ڈاکٹر محمد اقبال" کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں اقبال کی سوانح حیات اور فکر و فن کی تشریح کے علاوہ تمام اہم شعری مجموعوں سے منتخب کلام کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے کتاب کا انگریزی میں دیباچہ لکھا ہے۔ یہ کتاب یونیسکو کے زیرِ اہتمام ۱۹۷۴ء میں استنبول سے نہایت دیدہ زیب انداز میں طبع کی گئی ہے۔

جب ۱۹۳۱ء میں علامہ مصر گئے تو عاکف کی بنا پر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام ان کے نام اور کام سے آشنا تھا چنانچہ عزام ان سے ملا اور یوں یہ فکری رابطہ قلبی رابطہ میں تبدیل ہو گیا لیکن جہاں تک عربی تراجم کا تعلق ہے تو یہ پروفیسر حسن الاعظمی تھا جس نے ۱۹۲۷ء میں پہلی مرتبہ اقبال کے افکار کا عربی میں باضابطہ طور پر ترجمہ کیا۔ پروفیسر حسن الاعظمی نے اقبال پر بعض کتابیں مرتب بھی کیں۔ دیگر اقبال شناسوں میں محمد علی علویہ پاشا اور سید عبدالحمید خطیب اور نابینا شاعر شعلان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں لیکن جو شہرت عزام نے حاصل کی وہ بے مثال ہے اور کیوں نہ ہو عزام نے بھی تو کلامِ اقبال کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ وہ پاکستان بھی آئے تھے اور کلامِ اقبال کی تمام جہات سے آگہی کے لیے یہاں رہ کر اردو بھی سیکھی پیامِ مشرق کا منظوم عربی ترجمہ (۱۹۵۵ء) خاصے کی چیز سمجھا جاتا ہے اس کے علاوہ "اسرار و رموز" کا منظوم ترجمہ ۱۹۵۴ء میں قاہرہ سے طبع کیا ان کے علاوہ ۱۹۵۰ء میں "محمد اقبال، سیرۃ و شعر و فلسفہ" کے نام سے ایک مفصل

کتاب لکھی جس میں علامہ کے فلسفیانہ تصورات کے اساسی نکات سے بحث کی گئی ہے۔
آپ کے علم کے بعد عبادت نے روحانی بنا پر اقبال شناسی کی توفیق دی ہے۔ اس پیچیدہ بحث
مخصوص سیاسی مسلک کے لیے اقبال کے بعض شعراء مخصوص معانی میں استعمال کیے گئے
ہیں تاہم بعض ناقدین اور محققین کی طرح انہوں نے سیاسی مقاصد سے بلند ہو کر
اقبال کا اس کے فلسفیانہ تناظر میں مطالعہ کیا ہے۔ اس ضمن میں جن ناقدین نے خصوصی
شہرت حاصل کی وہ اقبال پر تنقیدی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے اقبال اور مغربی
مفکرین نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔

ان چند اہم کتابوں میں اقبال شناسی کی روایت کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔
اقبال صرف ان ہی کتابوں میں معروف نہیں بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال کا نام
دنیا اقبال کے نام اور افکار سے واقفیت رکھتی ہے۔ چنانچہ جرمنی، کینیڈا، ہندوستان،
مصر، سری لنکا، جاپان، ہیڈلبرگ، مراکو، ارجنٹائن، کس کس کا نام لیا جائے۔ اقبال شناس
ملتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات ڈاکٹر احمد علی جناح نے بڑی خوبصورت بات کہی
ہے۔

اقبال ایک نو دریافت براعظم کی مانند ہیں جس میں کئی
دلآویز اور قابلِ غور چیزیں ہنوز دست طلب ہیں۔

اور اس لیے ایک عالم کے لئے نئی دنیا اس نو دریافت براعظم کی کشش اور دلآویزی
اس کے کھوج میں نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اقبال کو محدود عالم قرار دینا تو غلط ہوگا
اس میں باعث ہے کہ یہ عین حقیقت ہے اور بعض [illegible]

اگرچہ مرد بمیرد بگردش مہ و سال
نمردہ است و نمیرد محمد اقبال

جبکہ ملک شعرا محمد تقی بہار کے بموجب :

عصر حاضر خامۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں گزشت
شاعراں گشتند چیزے تار و مار
دیں مبارز کرد کار صد سوار

(۲)

اس مختصر تمہید کے بعد کتابیات درج کی جاتی ہے تاکہ قبال شناسی کی ہمہ جہتی روایت کی وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کتابیات

(غیر ملکی زبانوں میں کلام اقبال کے تراجم ، علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر کتب مقالات تقاریر)

الف

کتب :

جیفرے آرتھر : (JEFFERY, ARTHUR)
Modernismo Mussulmano Del Indiano Sir Muhammad Iqbal
روم ، ۱۹۳۳ء۔

سیلرنو ، وتو : (SALIERNO, VITO)
"Due Poesie Di Iqbal", 1964

تراجم :

بوزانی ، لیساندرو : (BAUSANI, ALESSANDRO)
"Gulshan-i-Raz-i Gadid" (گلشن راز جدید) ، ۱۹۵۹ء۔

Il Poema Celeste" Istituto Italiano per IL Medio ed Estremo Oriente [illegible] روم ، ۱۹۵۲ء ، ص [illegible] ، صح دوم ، روم ، [illegible] ص [illegible] اطلع دوم میں [illegible] مشرق ، [illegible] ارمغان [illegible] تک ۔ رومی عجم کی منتخب مثنویات کے تراجم بھی شامل ہیں ۔

Poesie Di Muhammad Iqbal (منتخب نظمیں) کو [illegible] ۱۹۵۲ء [illegible] ص [illegible] ۔

مقالات :

[illegible] : Dante and [illegible] Modern Religious Poetry of Iqbal"

مشمولہ : [illegible] Iqbal Centenary Papers [illegible]

[illegible] Muhammad Iqbal (1873-1938)

مشمولہ : [illegible] Studi Orientali [illegible] ۱۹۵۵ء ۔

Dante and Iqbal"

مشمولہ : [illegible] ، کراچی ، [illegible] Pakistan Mission [illegible] ۱۹۵۰ء ۔

[illegible] of Religion and the West"

مشمولہ : پاکستان [illegible]

Muhammad Iqbal's Message"

مشمولہ [illegible] ۱۹۵۰ء [illegible]

[illegible] in the Religious Philosophy of Iqbal

مشمولہ : [illegible] Islam [illegible] ۱۹۵۳ء [illegible]

لوحی ، پروفیسر ہی : [illegible]

[illegible]

ریاض الحسن :

[illegible]

مشمولہ [illegible]

طرزل جی : (TAFFAREL, G)

' Notze Biographic Su Muhammad Iqbal''

مشمولہ : Oriente Moderno ، شمارہ ۸ ، ۱۹۳۸ء

نالینو ، ا : NALINO, M

'Recente Eco Indo-Persiano Della Divina Commedia Mu[illegible] Iqbal'

مشمولہ : Oriente Moderno ، [illegible]

افغانستان

مقالات :

احمد علی خان درانی ، شاہزادہ :

[illegible]

مشمولہ : [illegible]

ادارہ : [illegible]

مشمولہ : [illegible]

[illegible]

حاجم ، [illegible] : [illegible]

مشمولہ : [illegible]

کوہاٹ ، سرور خان : ''ڈاکٹر اقبال اور شعر فارسی''

مشمولہ : ''کابل'' کابل ، [illegible] ۱۹۳۱ء

''تقریظ و نقد مثنوی ''مسافر اقبال''

مشمولہ : ''کابل'' کابل ، دسمبر ۱۹۳۴ء

''وفات ڈاکٹر اقبال : شاعر ، متفکر و فیلسوف''

مشمولہ : ''کابل'' کابل ، مئی ۱۹۳۸ء (اس مضمون کے شریک مصنف : شاہزادہ احمد علی خان درانی)

جدی ، پروفیسر غلام حسین : ''یاد بود اقبال''

مشمولہ : ''ادب'' کابل ، جون جولائی ۱۹۶۵ء

''فلسفہ اقبال'' مشمولہ : ''ادب'' کابل ، اپریل تا جولائی ۱۹۶۷ء

''تقریر'' مشمولہ : اقبال ریویو ، کراچی - اپریل ۱۹۷۰ء

امریکہ

کتب :

مے ، ڈاکٹر لیمی س : MAY DR LINN S
[illegible] and Times

تقاریر / مقالات :

آلزباور ، ڈیوٹ ڈی :
"تقریر" [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بیس ، ڈاکٹر ایڈورڈ ایل : ELSON DR EDWARD L R
"تقریر" [illegible]
بیحیلڈ ، ڈبلیو اے : BEHAFELD W A
تبصرہ : Das Buch Der Kwaerit [illegible]
ترجمہ از تبصرہ مطبوعہ "دی [illegible]
شمارہ [illegible] اپریل [illegible]
ہولڈ ، والٹر ایچ : HOLD WALTER H
"تقریر" [illegible]
ہورڈل ، ڈاکٹر ولیم : HORDEN DR WILLIAM
'Poetry of Iqbal'
مشمولہ Panorama کراچی ، جون [illegible]
مجلہ یوم اقبال [illegible] کی تقریب میں کی گئی تقریر
ڈوگلس ، ولیم او : DOUGLAS WILLIAM O
"تقریر" مشمولہ [illegible]
مے ، لینی ایس : MAY LINN S
[illegible]
مشمولہ [illegible]
مہدی علی ہارپر ایل : MEHDI ALI HARPER L
[illegible]
مشمولہ [illegible] Papers [illegible]
[illegible]
میکڈونلڈ ، ایلفرڈ : MACDONALD ALFRED
[illegible]
[illegible]
میکڈونلڈ ، ایڈورڈ : MACDONALD EDWARD
[illegible]

آرتھروپ ، پروفیسر ایس سی :
"Iqbal through U' S eyes"
مشمولہ [illegible] کراچی [illegible] ۱۹۵۳ء

انڈونیشیا

کتب :

رنگ کوتی ، ترجمہ : (RANGKUTI, TRAD)
"Des Poemes Mystiques D'Iqbal" جکارتہ ، ۱۹۵۲ء
مونف : "Dr. Mohammad Iqbal" ، جکارتہ ،
Diterbitkan Dleh P T Inaltu 1977, P. 30

تراجم :

رنگ کوتی ، لکسمنا ایچ نیوم : RANGKUTI LAKSMA H FAHIUM
"Asrar-I-Khadi-Rahasia-Rahasia Pribadi" اسرار خودی) جکارتہ ،
۱۹۷۷ء ، ص ۱۹۲

تقاریر :

جان ، ڈاکٹر بہادر ڈی : (JOHAN, DR. BAHADER D)
"تقریر" مشمولہ اقبال ریویو ، کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء
ناصر ، محمد : (NATSIR, MOHAMMAD)
"تقریر" مشمولہ اقبال ریویو ، کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء

ایران

کتب :

اکرم، ڈاکٹر سید محمد : "اقبال در راہ مولوی ۔ شرح حال و آثار و سنگ اشعار و افکار اقبال" لاہور ، انجمن دوستی ایران و پاکستان ، ۱۹۷۰ء ، ص ۲۷۹
ورنگ ، بہاء الدین (مرتب) : "یادنامہ اقبال" ، لاہور ، خانۂ فرہنگ ایران ، ۱۹۷۸ء ، ص [illegible] ایران اور [illegible] پاکستانی اقبال شناسوں کے فارسی اردو اور انگریزی مقالات ، [illegible] ایرانی شعراء کا علامہ کو منظوم خراج عقیدت بھی شامل ہے ۔ مقدمہ : استاد محمد محیط طباطبائی)
پرجمدی ، ڈاکٹر احمد احمدی : "ندای راز ، شامل زندگی ، اندیشہ و شعر [illegible] دعوتی" مشہد ، چاپخانہ زوار ، ۱۹۷۰ء ، ص ۲۳۹
حجازی ، بختیاری : "سرود اقبال" تہران، انتشارات بعثت خیابان لالہ زار نو ۔ ۱۹۷۰ء ، ص [illegible]
محمد [illegible] : اقبال نامہ ۔ بیاد محمد اقبال ۔ تہران ، سنہ [illegible] ص [illegible]
رب ، فضل اللہ : "محمد اقبال" انجمن روابط فرہنگی ایران و پاکستان تہران ، ۱۹۷۳ء ، ص [illegible]
سعدی ، سید غلام رضا : "اقبال شناسی ، ہنر و اندیشہ محمد اقبال" ۔ تہران [illegible] محمد حسن اقبال و شرکاء ، ۱۹۵۹ء ، ص [illegible]
[illegible] ۱۹۷۰ء ، ص [illegible]

[illegible] سلامی [illegible] طبع اسلامی ، ۱۹۶۸ء
عرفانی ، ڈاکٹر عبدالحمید : ''اقبال و ایران'' ۔ تہران ، مطبوعات سفارت کبرای [illegible] ص [illegible]

[illegible] علامہ محمد اقبال'' تہران ۔ ۱۹۵۳ء ، ص [illegible]

[illegible] علامہ محمد [illegible] ''[illegible] مطبوعات سفارت کبری [illegible] ۱۹۵۵ء [illegible]

محمد [illegible] شعر [illegible] مطبوعات سفارت [illegible] ص [illegible]
علی شریعتی ، ڈاکٹر : [illegible] ''[illegible] ایران ، حسینیہ ارشاد ، سنہ ؟ ، ص [illegible]
محمد علی (داعی الاسلام) سید : ''اقبال و شعر فارسی'' حیدرآباد دکن ، [illegible] ۱۹۰۸ء ، ص [illegible]
قدری ، سید محمد تقی : ''اقبال متفکر و شاعر اسلام'' تہران ، چاپ [illegible] دوستی ، ۱۹۶۸ء ، ص [illegible]

''فکر اقبال'' کراچی ، فیروز سنز ، سنہ ؟ ، ص [illegible]
مینوی ، مجتبیٰ : ''اقبال لاہوری ۔ شاعر پارسی گوی پاکستان'' ، تہران ، ۱۹۳۸ء ، ص [illegible]
طبع دوم : ۱۹۷۳ء
(اردو ترجمہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
'' (مرتب) : کنگرۂ بزرگداشت شاعر و متفکر پاکستان'' ۔ تہران ، حسینیہ ارشاد ، ۱۹۷۳ء ، ص ۱۶۰
''اقبال نمبر'' تہران ، نومبر دسمبر ۱۹۵۱ء (۹۰ صفحات پر مشتمل اس اقبال نمبر میں کئی اہل قلم نے حصہ لیا ہے)

تراجم :

آریان پور ، ڈاکٹر امیر حسن : ''سیر فلسفہ در ایران'' تہران ، ۱۹۶۸ء ، ص ۳۰۲
(ترجمہ : ''فلسفۂ عجم'')
آرام ، احمد : ''احیای فکر دینی در اسلام'' تہران ، ۱۹۶۷ء ، ص ۲۲۵
(ترجمہ : ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'')
الاعظمی ، محمد حسن ، انصاری علی شملان اور سید محمد علی صدر : ''[illegible] اسلامی اقبال'' ۔ تہران ، حسینیہ ارشاد ، ۱۹۶۸ء ، ص ۶۵ (عربی فارسی اور اردو میں منتخب کلام)
عابدی ، پروفیسر وزیر الحسن : ''آثار اقبال ، راجع به شعر و ادب و هنرهای زیبا''

مشمولہ : ''ہلال'' کراچی ، جلد ۹ ، شمارہ
(یہ علامہ اقبال کے ان دو مضامین کے فارسی تراجم ہیں) :
(۱) مطبوعہ : ''نیو ایرا'' ۱۹۱۶ء
(۲) پیش لفظ مرقع چغتائی ، ۱۹۲۸ء
عرفانی ، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید : ''ضرب کلیم'' ۔ کراچی ، بزم اکیڈمی ۱۹۵۷ء ، ص ۱۶۰ (فارسی ترجمہ)
کوکب تبریزی ، آقای محمود الحسن : ''رومی و اقبال''
مشمولہ : ''ہلال'' ، کراچی ، جلد ۳۰ ، شمارہ ۲ ، مارچ ۱۹۵۸ء (بال جبریل کی نظم ''رومی و اقبال'' کا فارسی ترجمہ)
محمد علی صغیر ، سید ۔ الاعظمی ، محمد حسن دیکھیے (فارسی تراجم)

مقالات :

ارفع ، سر لشکر تیمسار : ''اقبال ، شاعر ایران و پاکستان''
مشمولہ : ہلال کراچی ، جلد ۱۰ ، شمارہ ۱۰ ، ۱۹۶۲ء (تیمسار سر لشکر ارفع سفیر کبیر دولت ایران کی وہ تقریر جو ۲۶ - اپریل ۱۹۶۲ء کو ملتان کے یوم اقبال میں کی گئی)
احسن ، دکتر عبدالشکور : ''ہنر از نظر اقبال''
مشمولہ : ''ہنر و مردم'' ، تہران ، شمارہ ۲-۱۹۷۷ء
زندان ، ڈاکٹر علی قلی : ''تقریر'' مشمولہ ''اقبال ریویو'' کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء
کرام ، دکتر سید محمد اکرم ''فلسفۂ سخن گوئی اقبال'' مشمولہ : مجلہ دانش کدہ ادبیات و علوم انسانی دانش گاہ تہران ، تہران ، بہار ۱۹۶۸ء

''مثنوی اسرار خودی ببان'' مشمولہ : ''ہنر و مردم'' ، تہران جون ، جولائی ۱۹۶۷ء

''کوشش اقبال برای احیای ملی'' مشمولہ : ''ہنر و مردم'' ۔ تہران ۔ شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
اللہ دتا چوہدری ، دکتر : ''گلانگ پہلوی ، برخی از واژہ‌های فارسی لب در شعر علامہ اقبال لاہوری''
مشمولہ : ہنر و مردم تہران شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
ایوب ، آقای محمد : ''اقبال و سعد نفیسی'' مشمولہ : ''ہلال'' کراچی ، جلد ۳ ، شمارہ ۱۱ سنہ ۱۹۵۶ء
بہار ، ملک الشعراء محمد تقی : ''یاد علامہ اقبال'' مشمولہ ''خیان جوان'' تہران ، جولائی ۱۹۵۰ء
بیگی ، دکتر اسمعیل : ''مجلس اقبال در مشہد مقدس''
مشمولہ : ''ہلال'' کراچی ، جلد ۱۱ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۶۳ء

[illegible] ڈاکٹر حامد حسن : "[illegible] و سنگھاں شعر فارسی"
[illegible] "ہلال" کراچی
[illegible] میں طبع ہو چکا ہے)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] مثنوی ہس چہ [illegible] کرد"
مشمولہ [illegible]

[illegible]
مشمولہ [illegible] ۱۹۵۵ء [illegible]
[illegible]

[illegible]
مشمولہ [illegible]
زیدی، [illegible] محمد [illegible]
[illegible] محمد [illegible] دانشگاہ مشہد، [illegible]
چودھری محمد حسین کے [illegible] فارسی [illegible]

مبادی اساسی فلسفۂ خودی، علامہ اقبال"
مشمولہ: معارف اسلامی، تہران، خودی [illegible]

"مناقب بدیع اہل بیت رسول در اشعار علامہ اقبال" مشمولہ: معارف اسلامی، تہران، تہران، بہار [illegible]

[illegible] محمد [illegible] محمدی" [illegible] اول
مشمولہ [illegible]

"[illegible] اقبال [illegible]"
مشمولہ [illegible]

[illegible]
خوری [illegible]

[illegible] علامہ [illegible]

[illegible]"
مشمولہ: ہنر و مردم، تہران، [illegible]
سید حسن رضوی، ڈاکٹر سید: [illegible]
مشمولہ [illegible]
سرور، غلام علامہ: [illegible] مشمولہ، علامہ اقبال کراچی، [illegible]
[illegible]

[illegible]"
[illegible] علامہ اقبال کراچی [illegible] ۱۹۵۷ء

[illegible]

[illegible] ہلال کراچی، [illegible] شمارہ، [illegible] ۱۹۵۳ء

سعدی، سید غلام رضا: "اہدافہای تعلیم و تربیت مکتب فکری [illegible]

نظر علامہ محمد اقبال" قسط اول

مشمولہ: "آموزش و پرورش" تہران، اگست ۱۹۶۶ء

[illegible] ایضاً، ستمبر ۱۹۶۶ء

[illegible] ایضاً، [illegible] ۱۹۶۶ء

[illegible] محمد شاہ احمد کے انگریزی مقالے کا فارسی [illegible]

[illegible]

مشمولہ: عصر و مردم، تہران، شمارہ [illegible] ۱۹[illegible]ء

شاہد، چوہدری: "[illegible] اقبال مولوی شمس"

مشمولہ: عصر و مردم، تہران، شمارہ [illegible] ۱۹[illegible]ء

شریف چوہدری، محمد: "ایران شناسی اقبال"

مشمولہ: [illegible] ۱۹[illegible]ء

شکفتہ، ڈاکٹر صغری بانو: "[illegible] و [illegible] حضرت [illegible]"

مشمولہ: عصر و مردم، تہران، شمارہ [illegible] ۱۹[illegible]ء

صوبیا، صادق: "[illegible] محمد اقبال شاعر فیلسوف" مشمولہ: "آموزش و پرورش"

تہران، [illegible] ۱۹۵۳ء، فرانسیسی سے ترجمہ

ظہور، حافظ محمد ظہور الحق: "[illegible] باد [illegible] شادروان ڈاکٹر [illegible] در تہران"

مشمولہ: عصر و مردم، تہران، شمارہ [illegible] ۱۹۴[illegible]ء

عبدالحمید عرفانی، ڈاکٹر خواجہ: "احوال زندگی علامہ اقبال"

مشمولہ: دانش، تہران، فروری ۱۹۵۰ء

"روسی عصر را تراجم روسی بر اقبال"

مشمولہ: دانش، تہران، جنوری ۱۹۵۱ء

[illegible]

[illegible]

عبدالحکیم، ڈاکٹر محمد: [illegible]

مشمولہ: [illegible]

علی [illegible] مطلوب: [illegible]

مشمولہ: [illegible]

غلام حسین صدیقی، ڈاکٹر: [illegible]

مشمولہ: [illegible]

[illegible]

نوراحمد اور ، رشید : "علامہ اقبال مایۂ فخر مشرق"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
نیمی ، سید فیض الحسن : "اقبال و عالم اسلام"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
نیمی ، ڈاکٹر نصراللہ : "اقبال لاہوری"
مشمولہ : کوثر ، تہران ، جولائی ۱۹۷۵ء
قسط دوم ، اگست ۱۹۷۵ء
کاشمی ، الٰہی حسن : "اقبال بر آستانۂ محمدؐ و آل محمدؐ"
مشمولہ : ہلال کراچی ، جلد ۱۰ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۶۲ء

"اقبال خالد صدای آشنا"
مشمولہ : ہلال کراچی ، جلد ۱۱ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۶۳ء
مقتدری ، محمد تقی : "روز اقبال در پاکستان"
مشمولہ : یغما ، تہران ، جلد ۹ ، شمارہ ۳
کوثر تیاری : "فکر و فن علامہ اقبال"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
کوثری ، علی اکبر : "اساس فلسفۂ اقبال شاعر پاکستان"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، نومبر ۱۹۶۵ء

"اقبال و ترکستان شرقی در بعد"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، مئی ۱۹۶۵ء
محجوب ، محمد جعفر : "نکتہ ہائی دربارۂ علامہ اقبال و شیوۂ شعراء"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، شمارہ ۱۲ ، ۱۹۷۷ء
محمد خان ، ڈاکٹر مہر اور : "پیغامبرئی کرد و پیمبر نتوان گفت"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
محمودی بختیاری ، علی اللی : "اقبال و پیام او"
مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، اپریل ، ۱۹۷۶ء
مشی ، جلال : "اقبال و ایران" مشمولہ : "مجلۂ دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی دانشگاہ فردوسی" مشہد ، شمارہ ۳ ، جلد ۱۳ ، ۱۹۷۷ء
مصدق ، آقای احمد : "افکار انقلابی علامہ اقبال"
مشمولہ : ہلال کراچی ، جلد ۱۲ ، شمارہ ۳ ، دسمبر ۱۹۶۳ء
مطہری ، علی اصغر : "خصیصہ" مشمولہ : اقبال ریویو ، کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء
مقتدری ، آقای ڈاکٹر : "خطابۂ ریاست در مراسم روز اقبال"
مشمولہ : ہلال کراچی ، جلد ۱۱ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۶۳ء (اقبال اکیڈمی کراچی کے یوم اقبال میں وزیر مختار ایران کی تقریر)
منشی کاشانی ، محمود : "علامہ اقبال (ادای احترام)"

مشمولہ رسالہ تہران [illegible] مئی ۱۹۵۰ء
محمد طباطبائی، سید محمد: "ترجمۂ حقیقت: شاعر پارسی محمد اقبال"
مشمولہ: ارمغان تہران، مئی ۱۹۳۸ء (ایران میں علامہ اقبال پر پہلا مضمون)

[illegible] "مشمولہ [illegible] تہران، جون ۱۹۵۰ء

"اقبال را باید شناخت" مشمولہ: یغما دور چہارم شمارہ ۵-۳

"شمارہ ویژۂ علامہ محمد اقبال"
مشمولہ [illegible] ۱۹۳۵ء
[illegible]

[illegible]

[illegible]
مشمولہ [illegible] تہران [illegible] ۱۹۴۱ء
مصطفیٰ، ڈاکٹر مظاہر: "[illegible]
[illegible] ۱۹۵۵ء
[illegible] ۱۹۵۵ء
مہر، پروفیسر اقبال، تہران [illegible] ۱۹۵۵ء
موقر، عبد: "[illegible] اقبال" [illegible]
مشمولہ: مہر، تہران، جون ۱۹۶۳ء
[illegible] ایضاً، جولائی ۱۹۶۳ء
مکی، ابوالفضل: "[illegible] اقبال لاہوری [illegible]
مشمولہ: مجلہ دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی [illegible] فردوسی [illegible]
[illegible] ۱۹۶۷ء
نصر اللہی، لیفٹیننٹ جنرل: "[illegible]" مشمولہ: [illegible]
۱۹۶۷ء
نسیم، ڈاکٹر ح۔ ب: "مولانا جلال الدین رومی و علامہ اقبال لاہوری"
مشمولہ: مہر و مردم تہران، جون ۱۹۴۵ء
نصیری، ڈاکٹر علی رضا [illegible]
۱۹۶۷ء
نوائی، ڈاکٹر عبدالحسین: "[illegible] عطار و رومی [illegible]
مشمولہ: اقبال نامہ، تہران، [illegible] دسمبر ۱۹۵۰ء
اوشاہی، گوہر: "[illegible]" مشمولہ: مجلہ دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی دانشگاہ فردوسی، مشہد، شمارہ [illegible] ۱۹۶۷ء
ہمایونفرخ، رکن الدین: "[illegible] علامہ اقبال [illegible] تصوف و عرفان"

مشمولہ : ہنر و مردم ، تہران ، شمارہ ۲ ، ۱۹۷۷ء
باسمی ؟ ، رشید : "عظمت اقبال لاہوری"
مشمولہ : "آموزش و پرورش" ، تہران نومبر ۱۹۵۳ء
یوسفی ، ڈاکٹر غلام حسین : "شاعر زندگی"
مشمولہ : اقبال ریویو کراچی - اپریل ۱۹۶۷ء (یہ مقالہ اس سے قبل ہلال کراچی جلد ۳ شمارہ ۵۰۳ ، ۱۹۶۶ء میں طبع ہوا تھا)
مولف ؟ : "نقد و مرحبا"
مشمولہ : ہلال کراچی ، جلد ۵ ، شمارہ ۲ ، ۱۹۵۷ء
مولف ؟ : "حضرت اقبال در بدخشاں"
مشمولہ : "سروش" کراچی ، جلد ۲ ، شمارہ ۲ یکم مئی ۱۹۵۸ء

برطانیہ

کتب :

آربری - اے - جے : "Notes on Iqbal's Asrar-i-Khudi" لاہور ، شیخ محمد اشرف ، ۱۹۵۲ء ، ص ۳۸ ، طبع دوم ۱۹۶۸ء ، ص ۵۶

تراجم :

آربری - اے - جے "Iqbal's Complaint and Answer" (شکوہ ، جواب شکوہ) لاہور ، شیخ محمد اشرف ، ۱۹۵۵ء ، ۱۹۶۱ء ، ۱۹۷۱ء ، ۱۹۷۵ء ، ص ۷۹

"Jawaid Nama" (جاوید نامہ) لندن ، جارج ایلن اینڈ اونن لمیٹڈ ، ۱۹۶۶ء - ص ۱۵۰

"Persian Psalms" (زبور عجم) لاہور ، شیخ محمد اشرف ، ۱۹۴۸ء ص ۱۰۷ طبع دوم : ۱۹۶۱ء ، طبع سوم : ۱۹۶۸ء

"The Tulip of Sinai" ("لالۂ طور" : پیام مشرق) لندن ، رائل انڈین سوسائٹی ۱۹۳۷ء ص ۳۵

"The Mysteries of Selflessness" (رموز بے خودی) لندن ، جان مرے ، ۱۹۵۳ء ، ص ۲۹

سپونر ، ڈاکٹر برینرڈ : SPOONER DR BRAINERD
"My Prayer"
مشمولہ : اقبال ریویو ، جلد ۲۶ ، شمارہ ۱ ، جنوری ۱۹۸۵ء (بانگ درا کی نظم "ایک آرزو" کا ترجمہ)

کیرنن ، وی - جے : (KIERNAN, V.J.)
"Poems from Iqbal" بمبئی ، لنکن پبلشرز سینڈیکیٹ ، ۱۹۴۷ء ص ۳۳ ، طبع دوم لندن ، جان مرے ، ۱۹۵۵ء ص ۱۱۲ (اقبال کی منتخب مطبوعات کے تراجم ،

نکلسن ، آر - اے : (NICHOLSON, R.A.)

The "Secrets of the Self" (اسرار خودی) لندن میکمن ، ۱۹۲۰ء صفحہ [illegible]
نظر ثانی شدہ لاہور ، شیخ محمد اشرف ، ۱۹۴۰ء ، ص [illegible] ، ماہنامہ اشاعتیں
۱۹۴۴ء ، ۱۹۵۰ء ، ۱۹۵۵ء ، ۱۹۶۰ء ، ۱۹۶۳ء ، ۱۹۶۹ء ، ۱۹۷۳ء ، ۱۹۷۵ء ، ۱۹۷۹ء ، ۱۹۸۵ء ، ۱۹۹۰ء ، ۱۹۹۵ء ، ۱۹۹۹ء ، ۲۰۰۰ء

مقالات :

آربری ۔ اے ۔ جے IQBAL COMMEMORATION, 1950
مشمولہ : ڈان کراچی ، ۹ ۔ مئی ، ۱۹۵۰ء

[illegible] and M[illegible] Interesting Comparison of Art and Thought
مشمولہ : سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ، ۲۶ ، نومبر ۱۹۵۹ء

تبصرہ : سر اے واحد کی کتاب : "Iqbal His Art and Thought"
لندن ۱۹۵۹ء
مشمولہ : اسلامک ریویو ، جلد [illegible] ، شمارہ [illegible] ، مارچ ۱۹۶۰ء
اوری ، پیٹر AVERY PETER
Iqbal A Great Soul of Rare Combination"
مشمولہ : ہفت روزہ "[illegible]" لاہور ، [illegible] ۱۹۷۰ء

"The Message of Metaphysics"
مشمولہ : سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ، [illegible] اپریل ۱۹۶۱ء
براؤن ، ای جی BROWNE E.G
تبصرہ : [illegible] "Secrets of the Self" [illegible]
مشمولہ : Journal of the Royal Asiatic Society, Part I [illegible]
۱۹۲۱ء
پکتھال ، محمد PICKTHALL, MUHAMMAD
"Sir Muhammad Iqbal's Lectures
مشمولہ : اسلامک کلچر ، حیدر آباد دکن ، جلد [illegible] ، شمارہ [illegible] ، اکتوبر ۱۹۳۸ء
(علامہ اقبال کی "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" پر تبصرہ)
رابنسن ، فرانسس ROBINSON FRANSIS,
مقالہ "دی لندن ٹائمز" ، لندن ، ۱۷ ، مارچ ۱۹۷۸ء
راس ، سر ڈینی سن ROSS, SIR DENISON,
[illegible]
مشمولہ : [illegible] ، اورنگ آباد ، دکن ۱۹۳۸ء (یہ تعریفی نوٹ ہے)
رونڈاٹ ، پیئر RONDOT, PIERRE
The Spirit of Movement in the History of Islam'
مشمولہ : Vision ، کراچی ، جلد [illegible] ، شمارہ [illegible] ، مئی ۱۹۹۹ء
ریڈ ، سر ہربرٹ READ, SIR HERBERT

"Readers and Writers" مشمولہ: The New Age ، ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء
("اسرار خودی" کا تجزیاتی مطالعہ)

سٹیفنسن ، آئن (STEPHENSEN, IAN)
"Memories of an Evening with Iqbal"
مشمولہ: پاکستان ٹائمز ، لاہور ، ۱۶ ستمبر ۱۹۷۷ء

فارسٹر ، ای ایم (FORESTER, E. M.)
تبصرہ: "Secrets of the Self" مشمولہ: (Athenaeum) ۱۹۲۱ء

"A COMMANDING GENIUS"
مشمولہ: پاکستان ٹائمز ، لاہور ، ۲۱ اپریل ۱۹۵۶ء

"Iqbal"
مشمولہ: پاکستان ریویو لاہور ، جلد ۱ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۵۳ء (فارسٹر کی لندن میں مطبوعہ کتاب: Two Cheers for Democracy (۱۹۵۲ء) کا ایک باب)

فرنانڈز ، اے (FERNAND(?)Z, A)
Man Divine (Great Appreciation of the Philosophy of the Ego according to Sir Muhammad Iqbal)
مشمولہ: Annali Laternanasi ، جلد ۳۰

کنڈریوا ، جارج جے (CONDREVA, GEORGE J)
"Iqbal: Philosophical Bridge for East and West"

"Iqbal and the Emergent Islam"
(دونوں مقالات مصنف نے تقسیم کیے)

مارکس ، مارگریٹ (MARCUS MARGARET)
"Iqbal: The Poet of Islam"
مشمولہ: وائس آف اسلام کراچی ، جلد ۹ ، شمارہ ۲
نکلسن آر۔ اے
"Iqbal's Message of the East"
مشمولہ: (۱) Islamica لیپزگ ، ۱۹۲۵ء جلد ۱ - (۲) دی کرسچنٹ ، اسلامیہ کالج میگزین لاہور ، جلد ۲۰ ، شمارہ ۸۱ ، مارچ اپریل ۱۹۲۶ء

"Summery of the Paper on the Asrar-i Khudi"
مشمولہ: جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی (حصہ اول) جنوری ۱۹۲۰ء

ولیمز ، پروفیسر رش بروک (WILLIAMS PROF RUSH BROOK)
خطبہ: مشمولہ: اقبال ریویو کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء

ہوبن - جے - جے HOUBEN, J. J.
Individual in Democracy and Iqbal's Conception of Khudi
مشمولہ : پاکستان کوارٹرلی ، کراچی جلد ۹ ، شمارہ ۱ ، ۱۹۵۹ء
ہرے ، آر HAKRE, R.
"Iqbal : A Reformer of Islamic Philosopher"
مشمولہ : The Hibbert Journal
جلد ۵۶ ، شمارہ ۳ ، جولائی ۱۹۵۸ء
ہیرس ، ایم - اے HARRIS, M. A.
"Allama Iqbal's Concept of Art"
مشمولہ : ایلسٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان ، کراچی ، جلد ۹ ، شمارہ ۲۹-۳۰
بابت ۱۹۵۲ء

بنگلہ دیش

کتب :

نور احمد ، ابوالفتحیٰ : "علامہ اقبال" ڈھاکہ ، پاکستان کتاب گھر ، ۱۹۶۰ء
ص ۸۷ ، ("نالۂ درد" اور "تصویر درد" کے تراجم از طیب الرحمٰن)۔

تراجم :

خان ، ابراہیم اور سعید الرحمٰن : "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ، ڈھاکہ
پاکستان پبلی کیشنز ، ۱۹۵۷ء۔
خان ، کمال الدین : "فلسفۂ عجم" ڈھاکہ ، مشرقی پاکستان اقبال اکیڈمی
۱۹۵۲ء ، ص ۱۰۵ (علامہ اقبال کے ڈی ایچ ڈی تھیسس "Development of Metaphysics in Islam" کا ترجمہ)۔
سلطان ، محمد : "شکوہ اور جواب شکوہ" ، رنگ پور ، ۱۹۳۶ء ، ص ۹۶ ،
طبع دوم ، ۱۹۵۹ء ، طبع سوم ۱۹۶۳ء۔
طیب الرحمٰن : "نالۂ یتیم اور تصویر درد" کے تراجم ، دیکھیے : نور احمد ، ابوالفتحیٰ۔
غلام مصطفیٰ : "کلام اقبال" کراچی ، اقبال اکیڈمی ۱۹۵۹ء ص ۸۰ ،
ڈھاکہ ، یکم محفوظ خالون ، ۱۹۵۹ء ، ص ۱۹۱ (اقبال کی منتخب منظومات کے منظوم تراجم)۔

"شکوہ جواب شکوہ" ، ڈھاکہ ، ۱۹۶۰ء ، ص ۳۳۔
قریشی ، غلام صمدانی : "رمضان صحرا" ڈھاکہ ، اقبال اکیڈمی پاکستان
۱۹۶۲ء ، ص ۳۔

محمد شہید اللہ ، ڈاکٹر : "شکوہ جواب شکوہ" ، ڈھاکہ ۱۹۴۵ء-۱۹۵۴ء ص ۱۳۸-۱۹۶ ، ص ۹۲ -

سرور الرحمن : "شکوہ و جواب شکوہ" کلکتہ ، کتاب محل ۱۹۴۳ء ، ص ۸۴ ، ۱۹۴۵ء ، ص ۸۳ -

یوسف ، سیر الدین : "اقبال کی منتخب مطلوبات" ڈھاکہ بنگلہ اکیڈمی ، ۱۹۴۷ء ، ص ۹۶

"اقبال کی نال جرنل" ڈھاکہ اقبال نذر الاسلام سوسائٹی ، ۱۹۶۰ء ، ص ۱۳۶ -

---

"شکوہ جواب شکوہ" کلکتہ ، کتاب محل ۱۹۴۳ء ، ص ۸۴ ، طبع دوم ، ۱۹۴۵ء -

مقالات :

[illegible] "Iqbal on the Nature of Self"

[illegible] "Iqbal Centenary Papers" [illegible] دانش گاہ پنجاب لاہور ، [illegible] کانگرس منعقدہ ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا) -

[illegible] Iqbal : His Mu[illegible]

[illegible] "Iqbal Centenary Papers" [illegible] دانش گاہ پنجاب ، لاہور [illegible] کانگرس [illegible] دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا) -

بھارت

کتب :

کلام اقبال گورمکھی میں : "بانگ درا" ، پٹیالہ ، بھاشا وبھاگ پنجاب ، ۱۹۶۱ء ، ص ۳۲۵ -

"بال جبریل" ، ایضاً ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۶۰ -

"ضرب کلیم" ، ایضاً ، ۱۹۶۳ء ، ص ۱۶۳ -

مقالات

آزاد ، پروفیسر جگن ناتھ : "Iqbal : His Art and Thought"

مشمولہ : "Iqbal Centenary Papers" (Vol. I) ، دانش گاہ پنجاب لاہور ، [illegible] اقبال عالمی کانگرس منعقدہ ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا) -

ترکی

کتب :

اسدوی ، ابوالحسن : "Bunak Islam Nasi Dr Muhammad Iqbal" ،

[illegible] ۱۹۵۹ء، ص ۹۲۔

محمد شجاع میاں : Rumi Ve Iqbal [illegible] پریس آف سلامت [illegible]

مکتبہ [illegible] ص [illegible]۔

فرمان، ڈاکٹر عبدالقادر : [illegible]

Dr. Muhammad Iqbal Ve Eserleri Uzerine Incelemeler

ڈاکٹر محمد اقبال [illegible] کے اسلوب [illegible]

[illegible] یونیسکو کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

[illegible] Dr. Muhammad Iqbal [illegible] ڈاکٹر محمد [illegible]

مسئول [illegible] Muhammad [illegible]

مؤلف : Muhammad [illegible]

[illegible] Al-Ma'arif 1952

تراجم :

مولانا علی میاں (ALI MIAN AL NADVI)

[illegible] Esrar-i Khudi [illegible]

[illegible] Esrar Ve Rumuz [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] Iqbal [illegible] Muhammad Iqbal [illegible]

[illegible]

[illegible] Zebiye Muhammad Sarmad

۱۹۶۳ء (منتخب مقالات کے تراجم) -

حوری ، صوفی (SOFI HURI)

"Islam Da Dini Tefeekkurun Yeni Den Tesekkulv" [illegible]

الٰہیات اسلام) استنبول ، ۱۹۶۳ء ، ص ۲۲۸ -

شمل ، این میری (SCHIMMEL ANNEMARIE)

Cavidname " (جاوید نامہ) انقرہ ، ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵۳ -

کوروجو ، علی علوی (KURUCU, ALI ULVI)

Buyuk Islam Şairi Dr. Muhammad Ikbal " ، انقرہ ، ۱۹۵۷ء ، ص ۸۳

(ابو الحسن علی ندوی کی کتاب کا ترجمہ) -

مقالات :

تارلان ، ڈاکٹر علی نہاد : " نیاز - آفاقی شاعر و نابغہ"

مشمولہ : ہلال کراچی ، جون ۱۹۵۸ء (یوم اقبال ۱۹۵۸ء ، کراچی کے موقع پر فارسی میں خطبۂ استقبالیہ)

ٹیولس

مقالات :

خالد ، ڈاکٹر احمد : " The Principle of Movement and the Philosophy of the Ego in Iqbal"

مشمولہ : اقبال ریویو کراچی اپریل ۱۹۶۷ء

جاپان

مقالات :

سائتو ، عبدالکریم (SAITO, ABDUL KARIM)

"Iqba : A Universal Leader

مشمولہ : "Iqbal Centenary Papers" (Vol. I) ، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۵۷ء (اقبال عالمی کانگرس منعقدہ ۹ تا ۱۸ دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا

جرمنی

کتب :

پروفیسر ، ہنری : دیکھئے ہنٹ ، ڈاکٹر بے منزا (مرتب)

شمل ، ڈاکٹر این میری (SCHIMMEL, DR. ANNE MARIE)

Gabriel's Wing لیڈن ، اے جی بریل ، ۱۹۶۳ء ، ص ۳۲۸

[illegible]

[illegible]

المراجع :

[illegible]

[illegible]

مقالات :

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مشمولہ : بلغی سفارت خانہ پاکستان ، بون ، جلد [illegible] ، شمارہ [illegible] ، [illegible] ۱۹۶۰ء -

---

"Muhammad Iqbal 1873-1938"

مشمولہ : "Die Welt Des Islam" ، [illegible] شمارہ [illegible] ، [illegible] ۱۹۳۹ء -

---

بعنوان : "Iqbal . His Art and Thought" ، (ز ایس ے و حد

مشمولہ : اسلامک ریویو ، ووکنگ ، جلد [illegible] ، شمارہ [illegible] ، [illegible] ۱۹۵۰ء

"The Idea of Prayer in Iqbal"

مشمولہ : سلم ورلڈ ، جلد [illegible] ، شمارہ ۳ جولائی ۱۹۵۱ء -

"Western Influence on Iqbal's Thought"

مشمولہ : (۱) پاکستان ٹائمز ، لاہور ۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء - (۲) سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ، ۲۱ اپریل ۱۹۶۲ء -

---

"Where East Meets West"

مشمولہ : پاکستان کوارٹرلی ، کراچی ، اگست ۱۹۵۱ء

"Iblis in Iqbal's Poetry"

مشمولہ : "Iqbal Centenary Papers" (Vol II) ، (دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۷ء ، (اقبال عالمی کانگرس منعقدہ ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا)

"The Origin of Early Sufism"

مشمولہ : "Journal of Pakistan Historical Society, 1958"

عبداللہ ، ڈاکٹر سید محمد "Hachrut Auf Iqbal"

مشمولہ : "Moslomische Revue" ، برلن ، اگست ۱۹۳۸ء

لک ، جے ڈبلیو (FUCK J. W.)

"Muhammad Iqbal Und Der Indomusulman Seb. 1954"

چیکوسلواکیہ

تراجم :

ماریک ژان اور کامل یدنار MAREK JAN AND KAMIL BEDNAR

"Poselsvtviz Vyebodu" (مشرق کا پیغام) پراگ ۱۹۶۰ء ، ص ۵۰ (منتخب

منظومات کے ترجمے

ماریک ، زاں JAN MEKE،

[illegible] Muhammad Iqbal [illegible] پاکستان [illegible]

[illegible]

چین

تراجم :

[illegible]

روس

تراجم

[illegible] گارنیف ، سیلیا : "محمد اقبال" ، ماسکو ، اکادمی علوم اتحاد جمہوریہ [illegible]

[illegible]

اردو

[illegible] ، [illegible] اور [illegible] ، [illegible]

[illegible] کلام کا ترجمہ

تاجیک

[illegible] ، [illegible] : "[illegible] مشرق" تاجکستان ، ۱۹۶۶ء ، ص [illegible]

، [illegible] ، پیام مشرق ، رموز بیخودی [illegible] ارمغان حجاز کی منظوم منظومات کے تراجم)

[illegible] ، عبداللہ جان : "محمد اقبال" ، دو شنبہ ، تاجکستان [illegible] ، ص ۳۱ ۔

مقالات :

[illegible] NIKOLY PETROVICH [illegible] نکولے پتروویچ

Muhammad Iqbal An outstanding thinker and Poet

Moscow Vostokovedenia, 1977

Social and Political views of M. Iqbal,' Soviet Orientalism, N 3, 1958

سیپنے تس ، ایم ٹی (SIEPANYATS, M T)

Probles of Ethics in Muhammad Iqbal's Philosophy

مشمولہ : Exploration ، گورنمنٹ کالج لاہور ۱۹۶۰ء

گلیبوف ، این (GLEBOV, N)

"A poet of the East" مشمولہ Contemporary Ea ، مرتبہ ، ۱۹۵۸ء

میر شاکر ، ایم (MIR SHAKIR, M,

"Muhammad Iqbal" ، دیباچہ ، Urdu ، سٹی آباد ، ۱۹۵۸ء

'Muhammad Iqbal' مشمولہ : Shafaq Surah مرتبہ ۱۹۵۸ء

سری لنکا

مقالات :

کروناریتن ، ڈبلیو ایس (KARUNARATNE, W. S.)

"Iqbal and the Third World' مشمولہ : Iqbal Centenary Papers

دانش گاہ پنجاب ، لاہور ۱۹۶۷ء

وجے رتن ، تسا (WIJEY RATNE, TISSA)

"Iqbal : The Leader of a New Muslim Renaissance'

مشمولہ : نیا ریویو کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء

سعودی عرب

کتب :

(مرتب) ؟ "شاعر الاسلام اقبال"، جدہ ، مطبعۃ [illegible] ۱۹۵۸ء ص ۸۰

(۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کے یوم اقبال کے مقالات)

سکاٹ لینڈ

ہارڈی ، جان ایل (HARDY, JOHN L)

"Iqbal : Poet of the East" ، (مراسلہ مضمون روزنامہ Scotsman ایڈنبرہ ، ۲۶ اپریل ۱۹۵۴ء)

سویڈن

تراجم :

سوینگ ، کارل ایف (SVENNING, CARL ELOF)

Skalden Son Skapade Pakistan' (منتخب مضمونات انگریزی ... ص ٦٣

مقالات :

سوینگ ، کارل ایلوف SWENNING CARL ELOF

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تمام

کتب :

علی ندوی ، ابوالحسن [illegible]

[illegible] : [illegible] ترجمہ محمد [illegible]

ہود ، ڈاکٹر محمد عبد [illegible] الشاعر و [illegible] و [illegible]

[illegible]

؟ (مرتب) [illegible] محمد [illegible] دمشق ، دار الفکر ، [illegible]

فرانسی

کتب :

میتر ، لوس کلود MAITRE, LUCE CLAUDE

"Introduction a la Pensee d'Iqbal" پیرس ، [illegible] ص [illegible]

[illegible]

[illegible] ص [illegible]

[illegible]

"Mohammad Iqbal" پیرس ، [illegible] ص [illegible]

تراجم :

میریووچ ، ایوا MEYEROVITCH EVA

"Reconstruire la Pensee religieuse de l'Islam" پیرس ، [illegible]

[illegible] ترجمہ : تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، مقدمہ ، [illegible] محمود

میریووچ ، ایوا اور محمد ایکا MOHAMMAD ACHENA

"Mohammad Iqbal" [illegible] مشرق ، [illegible] ص [illegible]

میریووچ ، ایوا اور محمد علم [illegible] پیرس [illegible]

مقالات :

سمیع ، لوس کولا : "Iqbal : A Great Humanist"

مشمولہ : اقبال [illegible]

مسی ، پروفیسر ہنری MASSE PROF HENRI

[illegible]

[illegible] اپریل ۱۹۵۵ء

میسنیون ، ایل MASSIGNON, L.

[illegible] : "Introduction à la Pensée Religieuse de l'Islam"

اقبال کے خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامی کا [illegible]

[illegible]

جیرلوک ، ایوا [illegible] Poète et Philosophe

[illegible]

علی ، مراد : "Penseur Musulman Moderne, Mohammad Iqbal (1873-1938)"

مشمولہ : Journal de l'Institut Des Belles Lettres Arabes Tome [illegible]

[illegible]

فلپائن

مقالات :

جلال الدین ، ڈاکٹر آر جویل JALAL UD DIN DE LOS SANTOS, DR. R. JOEL

Mohammad Iqbal and National Unity

مشمولہ : "Iqbal Centenary Papers" (Vol. II) ، دانش گاہ پنجاب ، لاہور

([illegible] میں پیش کیا گیا)

فن لینڈ

کتب :

برومز ، ہنری BROMS HENRI

(Muhammed Iqbal) [illegible] ۱۹۵۷ء ، ص ۳۲

مقالات :

آرو ، جسی (ARO, JUSSI)

"Iqbal's Linguistic Situation"

مشمولہ : Iqbal Centenary Papers, Vol. II [illegible] ، لاہور

۱۹۷۷ء - (اقبال عالمی کانگریس منعقدہ لاہور دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا)

کینیڈا

مقالات :

مکڈونف ، ڈاکٹر شیلا MCDONOUGH DR SHEILA

Mosque of Cordova Visit of Persist

[illegible]

Prophets Fa[illegible] Iqbal Buber and Ethics

مشمولہ Iqbal Centenar. Papers [illegible]

[illegible]

لبنان

مقالات :

[illegible] 'Iqbal in the Arab. Language'

[illegible] ، دانش گاہ پنجاب لاہور

[illegible] عالمی کانگریس منعقدہ لاہور دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا

عمصانی ، ڈاکٹر صبحی MAHMASSANI DR SOBHI

Iqbal Leader, Thinker and Reformer'

مشمولہ : Iqbal Centenary Papers" (Vol. I) ، دانش گاہ پنجاب ، لاہور

۱۹۷۷ء - (اقبال عالمی کانگریس منعقدہ لاہور دسمبر ۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا)

مراکش

مقالات :

فہد ، پروفیسر ابن آز [illegible] تعریب" مشمولہ [illegible]

۱۹۹۷ء

مصر

کتب :

الاعظمی ، محمد حسن اور الصاوی علی شعلان : "الحب و الموت فی فلسفۃ اقبال" ، مصدر ابداعہ ، مرکزی بزم اقبال ، [illegible] ، ص [illegible]

کراچی ، الاردو یونیورسٹی ، ۱۹۷۹ء ، ص [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"مدخل الاسلام" قاهرہ، سفارت خانہ پاکستان، سنہ ؟ ص ۸ (طوع اسلام کا ترجمہ)

عبدالحمید فراہی، امام: "اسباب و نزول القرآن" مجلہ

لاہور، مکتبہ اسلامیہ، ۔۔۔ ص ۔۔۔ (اسباب مجاز کا عربی ترجمہ

عراق، ڈاکٹر عبدالوہاب: "اصول الاسرار والرموز"

قاہرہ: دار المعارف، ۱۹۵۹ء، ص ۱۵۵

"اسلام مصری" کرمی، محسن قاسم، ۱۹۵۰ء، ص ۔۔۔

"عرب کیا" ۔۔۔، قاہرہ، جامع ازہر، ۱۹۵۰ء، ص ۔۔۔

محمود، عباس: "حدیث تکفیر اہل فی الاسلام"

قاہرہ، ۱۹۵۵ء، ص ۔۔۔

Reinterpretation of Religious Thought in Islam (عربی ترجمہ)

مقالات:

الخشاب، ڈاکٹر مصطفیٰ: "Muhammad Iqbal"

مسجلہ: اقبال ریویو، اپریل ۱۹۶۰ء

الصباغی، یوسف: "Islam: A Philosophical and a Political Ideal"

مسجلہ: اقبال ریویو، کراچی، اپریل ۱۹۶۰ء

حوادث، پروفیسر صالح: "Ideal State and Ideal"

مسجلہ: اقبال ریویو، کراچی، اپریل ۱۹۶۰ء

حجی، ڈاکٹر محمد عبدالقادر: "حضارۃ" مسجلہ: اقبال ریویو، کراچی

اپریل ۱۹۶۰ء

طہٰ، ڈاکٹر حسین: "اقبال الشاعر"

مسجلہ: "الکشف"، بیروت، مئی جون ۱۹۵۰ء

"محمد اقبال: مجدد الفکر الاسلامی فی العصر الحاضر" مسجلہ: "الکاشف"

بیروت، مئی جون ۱۹۵۰ء

"اقبال کا مصری کو پیغام" انگریزی ترجمہ، ڈاکٹر صوفی عبدالحمید

(انگلستان) ۔۔۔ ص ۔۔۔ (اقبال نمبر)

عراق، ڈاکٹر عبدالوہاب: "الشعر اقبال" مشمولہ، مجلہ قاہرہ

اکتوبر ۱۹۵۰ء، ۱۰ اگست ۱۹۵۰ء کو اسکندریہ میں منعقدہ سیرت کانفرنس

اجلاس میں پڑھی گئی تقریر

علی الحبروک ، محمد : (ALY AL-HABROUK, MUHAMMAD)
"Mohammad Iqbal" مشمولہ : پاکستان ریویو ، کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء
(روزنامہ "الجمہوریہ" قاہرہ میں مطبوعہ عربی مقالہ کا ترجمہ)
محمود ، ڈاکٹر عبدالقادر : Mohammad Iqbal and Modern Religious
Thought" مشمولہ : اقبال ریویو کراچی ، اپریل ۱۹۶۷ء ("الفکر المعاصر"
قاہرہ میں مطبوعہ عربی مقالہ کا ترجمہ)

کتب :

جن میں علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے حوالے ملتے ہیں ۔ (انسائیکلوپیڈیا
شامل ہیں)
اومیلے ، ایل ایس ایس : (O'MALLEY, L.S.S.)
"Muslim India and the West : A Study of the Interaction of their
Civilizations"
لندن ، ۱۹۴۰ء (ذکر اقبال : ص ۳۰۵ ، ۳۳۰ ، ۵۳۰)
بوزانی ، ایساندرو : "Crescent and Green"
(پاکستان کے بارے میں متفرق مقالات کے اس مجموعہ میں علامہ اقبال پر بھی
ایک باب ہے)
: "Iqbal : His Philosophy of Religion and the West"
لندن ، ۱۹۵۵ء ، ص ۱۰۷
تھامپسن ، ایڈورڈ : (THOMPSON, EDWARD)
"Enlist India for Freedom" وکٹری بک شاپ ، لندن ، ۱۹۴۰ء
(ذکر اقبال ، ص ۱۰۸)
خان رفیق ایم اے اور ہربرٹ ایس سٹارک : "Young Pakistan"
لندن ، ۱۹۵۱ء (ذکر اقبال ، ص ۱۰۶ ، ۱۰۷)
راجو پی۔ٹی : (RAJU, P.T.)
"Idealistic Thought of India" لندن ، ۱۹۵۳ء
(اقبال کے بارے میں باب کا عنوان ہے :
Idealism of Sir Muhammad Iqbal ص ۳۸۰-۳۹۰)
رش برک ، ولیمز (مرتب) : (RHSHBROOK, WILLIAMS)
"Great Men of India" بمبئی ، ۱۹۴۱ء
(اس کتاب میں شیخ سر عبدالقادر کا یہ مقالہ شامل ہے :
"Sir Muhammad Iqbal , The Great Poet of Islam, 1873-1938")

سمتھ ، ولفرڈ کینٹول : (SMITH, WILFRED CANTWELL)

"Modern Islam in India" لاہور ، ۱۹۴۳ء ، ۱۹۴۷ء ، ص ۴۵۵

(ذکر اقبال ، ص ۹۹-۱۰۰)

"Islam in Modern History" پرنسٹن ، ۱۹۵۷ء ، ص ۲۰۰

(اقبال کا مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے)

سیمنڈز ، رچرڈ : (SYMONDS, RICHARD)

"Making of Pakistan" لندن ، ۱۹۵۰ء

(ذکر اقبال ، ص ۳۰۳-۳۰۴)

لیختنٹر ، ایلزا : (LICHTENTADTER ILSA)

"Islam and the modern age" لندن ، ۱۹۳۹ء

(اقبال کا تذکرہ تمام کتاب میں ملتا ہے)

لارمنٹر ، ای ایم : "Two Cheers for Democracy"

(اس کتاب میں "ایم اقبال" کے عنوان سے ایک باب علامہ اقبال کے لیے وقف کیا گیا ہے) لندن ، ایڈورڈ آرنلڈ اینڈ کمپنی ، ۱۹۵۱ء

گب ، سر ہملٹن : (GIBB, SIR HAMILTON)

"Dictionary of National Biography 1931-1940" میں مقالہ بعنوان ،

"اقبال" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ، ۱۹۵۰ء

"Modern Trends in Islam"

شکاگو یونیورسٹی پریس ، ۱۹۴۶ء

(ذکر اقبال ، ص ۱۰۰-۱۰۱)

"Muhammadanism An Historical Survey"

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ، ۱۹۵۰ء

(ذکر اقبال ، ص ۱۸۵-۱۸۶)

گیوم ، الفریڈ : (GUILLAUME ALFRED)

"Islam" پینگن بک ، ۱۹۵۴ء

(ذکر اقبال ، ص ۱۵۸-۱۶۰)

مارگن ، کینتھ ڈبلیو (مرتب) : (MORGAN, KENNETH W)

"Islam the Straight Path : Islam Interpreted by Muslims"

(اس کتاب میں حسن بصری کے ایک مقالہ بعنوان :

"Islamic Culture in Turkish Area" میں صفحہ ۲۹۱ پر اقبال کا تذکرہ

کیا گیا ہے) نیو یارک ، ۱۹۵۸ء ، ص ۳۵۴

- ایران میں اقبال شناسی کی روایت — ڈاکٹر سلیم اختر — ۳۰/۰۰
- اقبال اور ہمارے فکری رویے — 〃 — ۳۰/۰۰
- فکرِ اقبال کا تعارف — 〃 — ۱۵/۰۰
- فکرِ اقبال کے منوّر گوشے — مرتبہ: 〃 — ۳۰/۰۰
- اقبال شعاعِ صد رنگ — 〃 〃 〃 — ۳۰/۰۰
- اقبال اور مشاہیر — مرتبہ: ظاہر قادری — ۳۰/۰۰
- تقدیرِ امم اور اقبال — ڈاکٹر محمد ریاض — ۴۰/۰۰
- افکارِ اقبال — سمیع اللہ قریشی — ۲۱/۰۰
- قرآن اور اقبال — ابو محمد مصلح — ۲۱/۰۰
- اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں — مرتبہ: حنیف شاہد — ۳۰/۰۰
- اسرار و رموز (ترجمہ پنجابی) — خلیل آتش — ۲۱/۰۰
- ارمغانِ حجاز (〃) — عبد الغفور اظہر — ۲۱/۰۰
- مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر (ترجمہ پنجابی) — 〃 — ۲۱/۰۰
- شکوہ جواب شکوہ — علامہ اقبال — ۳/۰۰
- اقبال کی طویل نظمیں — ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی — ۲۵/۰۰
- عملِ چغتائی — عبد الرحمٰن چغتائی — ۱۰۰۰/۰۰

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور